سہاگن

ایم اسلم

ہندوستانی پبلیشرز
دلی

طبع اول، جنوری سنہ ۱۹۴۴ء قیمت 2/-

سول ایجنٹس، نگارستان ایجنسی- اردو بازار - دلی

ہندستانی پبلیشرز دلی نے دیال پرنٹنگ پریس دلی میں چھپواکر شائع کی

فہرست

تہذیبِ فرنگی ہے اگر مرگِ امومت
ہے حضرتِ انساں کے لئے اس کا ثمر موت

جس علم کی تاثیر سے زن ہوتی ہے نازن
کہتے ہیں اسی علم کو اربابِ نظر موت

بیگانہ رہے دیں سے اگر مدرسۂ زن
ہے عشق و محبت کے لئے علم و ہنر موت

(اقبالؒ)

سہاگن

رقیہ ایک شریف خاندان کی چشم و چراغ تھی۔ باپ بہت بڑا زمیندار تھا، حاکم اور محکوم دونوں میں عزت تھی رقیہ نے انٹرنس تک تو ایک سرکاری زنانے مدرسے میں تعلیم پائی۔ اس کے بعد گھر پر مطالعہ جاری رکھا اور انگریزی میں اچھی خاصی دسترس پیدا کر لی۔

رقیہ بڑی حلیم الطبع۔ ملنسار اور خوش مذاق لڑکی تھی۔ اچھا کھاتی اچھا پہنتی اور امیرانہ ٹھاٹھ سے رہتی۔ اٹھارہ سال کی عمر میں ایک شریف اور امیر گھرانے کے اچھے تعلیم یافتہ نوجوان میاں رشید سے بیاہی گئی۔ رشید بہت خوش مزاج حلیم الطبع

نوجوان تھا۔ اور ایک حد تک مغربی تعلیم کا دل دادہ بھی۔ بیوی بھی وہ ملی کہ اگر چراغ لے کر بھی کوئی ڈھونڈے تو نہ ملے۔ دونوں ایک عالیشان مکان میں رہتے تھے۔ نوکر چاکر ساز و سامان ایک دو اسپہ گاڑی اور ایک موٹر اللہ کا دیا سب کچھ موجود تھا۔ شادی کے دو سال بعد خدا نے ایک چاند سا بیٹا بھی عطا کیا۔ میاں رشید نے بیٹے کا نام قمر رکھا۔

شادی کے یہ دو سال تو آنکھ جھپکنے میں گذر گئے۔ رشید رقیہ کا والہ و شیدا تھا اور رقیہ دل و جان سے شوہر کی تابعدار۔ لیکن قمر کی پیدائش کے کچھ عرصہ بعد رشید کی رقیہ کی طرف کچھ پہلی سی توجہ نہ رہی۔ ایک روز باتوں باتوں میں رشید نے رقیہ سے کہا۔

"رقیہ! اسلام میں تو چار بیویاں کرنے کی اجازت ہے۔ لیکن عورت کی فطرت ایک سوکن بھی گوارا نہیں کر سکتی آخر اس کی وجہ کیا ہے"؟

"عورت جو ٹھہری" رقیہ نے قمر کو پیار کرتے ہوئے جواب دیا "ایک نیام میں دو تلواریں نہیں رہ سکتیں"

"یہ تو کوئی جواب نہیں" رشید نے کہا "سوال یہ ہے کہ اگر عورت ایسی ہی کم ظرف اور ایسی ہی تنگ نظر تھی تو پھر اسلام نے ایک

سے زیادہ نکاح کرنے کی اجازت ہی کیوں دی۔ اسلام کے سوا کوئی مذہب بھی ایک سے زیادہ بیاہ کرنے کی اجازت نہیں دیتا ہاں! پہلی بیوی کے مرنے کے بعد دوسری شادی ہو سکتی ہے۔"

"ٹھیک ہے!" رقیہ نے جواب دیا۔ "لیکن اسلام کی تعلیم ایسی ہے کہ اگر ایک شخص ایک بیوی کے ہوتے ہوئے ایک اور سے شادی کرے تو بے لطفی پیدا نہیں ہو سکتی۔ بشرطیکہ اسلام کی شرائط پر ترازو کے تول عمل کرے۔"

"سب کہنے کی باتیں ہیں" رشید نے ہنس کر کہا۔ "شکر کرو کہ تم اس امتحان میں نہیں پڑیں"

تو آپ امتحان لینا چاہتے ہیں۔ رقیہ نے ہنس کر کہا۔

"کوئی امتحان کے لئے تیار بھی ہو" رشید نے مسکرا کر کہا۔

"لے لیجئے امتحان" رقیہ بولی "ہے آپ کا ارادہ"

"ارادہ تو ہے" رشید سن کر بولا۔ لیکن تم فیل ہو گئیں تو تمہاری ناراضگی سے بھی ڈر لگتا ہے"

"میں ناراض کیوں ہونے لگی" رقیہ قمر کو پیار کرتے ہوئے بولی "میری دنیا تو اب میرا قمر ہے۔ آپ دونوں سلامت رہیں میری دنیا آباد ہی آباد ہے۔"

رشید قمر کو گود میں لے کر پیار کرنے لگا۔

"تو پھر میں ایک شادی اور کر لوں" رشید نے ہنس کر پوچھا
"اجازت ہے"

"شوق سے" رقیہ نے ہنس کر کہا "کیا مذائقہ ہے"

"اجازت ہے نا؟" رشید نے پھر ہنس کر پوچھا۔

"بے شک!" رقیہ نے ہنس کر کہا "بالکل"

رشید ہنسنے لگا۔

اس گفتگو کے کوئی پندرہ بیس روز بعد رشید کہیں سے گھومتا ہوا گھر آیا اور آتے ہی رقیہ سے کہنے لگا۔

"میرے ایک دوست ملنے آئے ہیں۔ چند روز میرے مہمان رہیں گے۔ میں نے ان کو علیحدہ مکان میں اتروایا ہے۔ چائے وغیرہ کا تو وہیں انتظام ہو جائے گا لیکن تمہیں تکلیف نہ ہو تو دونوں وقت کا کھانا گھر سے بھجوا دیا کرو"

"کون ہیں؟" رقیہ نے پوچھا "کہاں سے آئے ہیں؟"

"کالج کے وقتوں سے میری ان سے ملاقات ہے" رشید نے مہمل سا جواب دیا "دس پندرہ روز غالباً رہیں گے۔ میں نے

مصلحتاً ایک باورچی بھی رکھ لیا ہے"۔

"علیحدہ باورچی رکھنے کی کیا ضرورت تھی" رقیہ بولی "یہیں گھر میں انتظام ہو جاتا"۔

"کھانا تو گھر سے ہی جایا کرے گا" رشید نے جواب دیا "باورچی تو وقت بے وقت کی ضرورت کے لئے رکھ لیا ہے۔ دس پندرہ روپے دے دیں گے"۔

"دسترخوان پر کتنے آدمی ہوا کریں گے؟" رقیہ نے پوچھا۔

"دو تو ہم ہوں گے" رشید بولا "اور ایک آدھ نوکر"۔

"بہت اچھا" رقیہ نے جواب دیا "جو کچھ پکوانا ہو وقت سے پہلے بتا دیا کیجئے"۔

اب کئی روز سے رقیہ کے ہاں سے دونوں وقت کا کھانا پک کر جانے لگا۔ رشید اکثر دن بھر غائب رہتا کبھی گھڑی دو گھڑی کے لئے آجاتا رات کو بھی اکثر دس گیارہ سے پہلے نہ آتا۔ پھر کبھی کبھی رات کو بھی غائب رہنے لگا۔ آخر ایک روز رقیہ نے شکایت کے طور پر کہا۔

"آپ دن بھر تو کہیں نظر آتے نہیں۔ اب رات کو بھی باہر رہنے لگے۔ اچھے دوست آئے آپ کے جو گھر آنا بھی چھوٹ گیا"

"رقیہ! رشید بولا "وہاں سے کسی وقت اٹھنا ہوتا ہی نہیں۔ سارا دن ملنے ملانے والوں کا تانتا سا بندھا رہتا ہے۔ خود سخت پریشان ہو رہا ہوں"

رقیہ نے شوہر کی طرف دیکھا لیکن خاموش رہی۔ رشید بولا۔

"تم ناراض تو نہیں رقیہ؟"

"میں کیوں ناراض ہونے لگی!" رقیہ نے ذرا روکھے پن سے جواب دیا۔

"پھر چپ کیوں ہو؟"

"آپ کوئی بات کریں تو جواب بھی دوں" رقیہ نے کہا۔ "یا ایسے ہی بک بک کئے جاؤں"

رشید نے رقیہ کی گود سے قمر کو لے لیا اور پوچھا۔

"قمر میاں سبیر کو تو جانتے ہیں؟"

"ہاں!" رقیہ نے کہا "دونوں وقت"

دیکھو رقیہ!" رشید بچے کا منہ چوم کر کہنے لگا "ہمارے قمر میاں کو اگر تم نے کبھی ناراض کر دیا تو ہم بھی ناراض ہو جائیں گے اتنے میں ماما نے آکر کہا کہ کوئی صاحب ملنے آئے ہیں۔ رشید جو اٹھنے کا بہانہ ہی ڈھونڈھ رہا تھا باہر چلا گیا۔

اس محلے میں ایک بڑھیا جو بڑی باتونی مشہور تھی رہتی تھی۔ اکثر گھروں میں اس کا آنا جانا تھا۔ سب عورتیں اُسے بڑی بی کہا کرتیں اور مزے مزے سے اس کی باتیں سنا کرتیں۔ رشید کو باہر گئے تھوڑی دیر ہی ہوئی تھی کہ بڑی بی کہیں سے آ گئیں۔

بڑی بی! اچھی تو ہو؟" رقیہ نے پوچھا۔

"بیٹی!" بڑی بی بے تکلفی سے تخت پر بیٹھتے ہوئے بولیں۔ جان و مال کو دعا دیتی ہوں بیٹی! قمر میاں تو اچھے ہیں۔ کیا چاند سا مکھڑا ہے دلہن بھی چاند ایسی ہی بیاہ کر لائے گا۔

"بہت دنوں پیچھے آئی ہو" رقیہ نے کھانا نکالتے ہوئے پوچھا۔

"آنے کو تو کئی بار دل چاہا" بڑی بی نے جواب دیا۔ "لیکن گھر سے نکلنا ہی نہ ہوا۔"

"روٹی کھا لو" رقیہ نے کہا۔

"یہ کھانا کس کے لئے بھیجا جا رہا ہے؟" بڑی بی نے پوچھا۔

"قمر کے ابا کے لئے"

جب ماما کھانا اٹھا کر لے گئی تو بڑی بی کہنے لگیں۔

"رقیہ بیٹی! کچھ تم نے بھی سنا؟"

"کیا؟" رقیہ نے کہا۔ "آج کیا خبر لائی ہو؟"

"سنتی ہوں!" بڑی بی کہنے لگیں "رشید میاں نے دوسری شادی کر لی ہے۔"

"دوسری شادی؟" رقیہ نے بڑی بی کی طرف تعجب سے دیکھتے ہوئے کہا "کس سے سنا تم نے؟"

"تو گویا تمہیں کچھ معلوم ہی نہیں" بڑی بی بولیں "الگ کوٹھی میں رہتے ہیں مہینے سے کچھ اوپر ہی دن ہونے کو ہیں"

"تم سے کس نے کہا" رقیہ نے پوچھا۔

"کسی ایک سے تو نہیں سنا" بڑی بی بولیں "ایک دنیا کہہ رہی ہے۔ گھر گھر یہی قصہ ہے "گھر کو لگی ہے اور تمہیں معلوم ہی نہیں"

رقیہ یہ سن کر خاموش ہو گئی۔ اس کے دل پر سخت چرکا لگا۔ اور رشید کی بے التفاتی کی سبب قلعی کھل گئی۔ بڑی بی کہنے لگیں۔

"کیا سوچتی ہو رقیہ؟ سوچنے سے کچھ نہ بنے گا۔ حرکت میں برکت ہے"

"تو میں کیا کروں" رقیہ بولی۔

"تم چاہو تو سب کچھ ہو سکتا ہے" بڑی بی نے جواب دیا "ہاں! اپاہج ہو کر بیٹھ رہو تو پھر کچھ نہیں ہو سکتا"

"آخر کچھ کہو بھی" رقیہ نے پوچھا۔

"پہلے تو یہی" بڑی بی بولیں۔ "کہ یہ کھانا روک لو۔"

"پھر" رقیہ نے مسکرا کر کہا "اس کے بعد"

"پھر ایک دم بات چیت کرنی چھوڑ دو" بڑی بی نے کہا "بلائیں بھی تو مت بولو"

"پھر" رقیہ نے پھر اسی انداز سے کہا۔ پھر کیا کروں؟

"پھر یہ کہ جب آئیں کسی نہ کسی ڈھنگ سے لڑنے لگو۔ بڑی بی نے جواب دیا۔

اور ان باتوں کا نتیجہ؟" رقیہ نے پوچھا۔

"بس خود ہی راہ پر آجائے گا" بڑی بی نے کہا "مرد کو تنگ کئے جاؤ آخر ہار مان جائے گا"

"بڑی بی!" رقیہ بولی "خیر! بات تو تم نے خوب مزے کی کہی لیکن کچھ ثبوت بھی ہے یا ثبوت سنائی پلے باندھ لی"

"ثبوت! بڑی بی نے پوچھا۔ ثبوت چاہتی ہو تو کسی نوکر کو بھیج کر دریافت کر لو۔ یا میری صلاح مانو تو "شکرم" میں سوار ہو کر خود ہی چلی جاؤ اور اس مردار کی چوٹی پکڑ کر باہر نکال دو۔ اگر میاں ایک کہے تو دس سناؤ۔ خود ہی عزت کے ڈر سے مان جائے گا۔ اور یہ مصیبت تمہارے سر سے ٹل جائے گی۔

رقیہ کچھ سوچنے لگی۔ پھر بولی۔

"نہیں! مجھ سے یہ نہیں ہو سکتا"

"کیا نہیں ہو سکتا؟" بڑی بی نے پوچھا۔ "انہی باتوں سے تو مرد سر چڑھتے ہیں۔ پھر تمہیں ایسی کیا پڑی کہ سوکن کے لئے کھانا پکوا کر بھیجو۔ لوٹ دو یہ سالن دیگچی ہیں۔

"بڑی بی" ! رقیہ کہنے لگی۔ "جو کچھ تم کہتی ہو اگر یہ سچ بھی ہو تو پھر بھی انسان کو شرافت کا بھی تو خیال رکھنا چاہیئے۔ سننے والے کیا کہیں گے۔

"سننے والے جائیں بھاڑ میں!" بڑی بی نے کہا۔ "جب رشید کو تمہاری پرواہ نہیں تو تم بھی اس شرافت پر بھیجو ہزار لعنت، وہ شرافت ہی کیا جس سے جان پر ہی آ بنے"

"جان پر کیوں آ بنے" رقیہ بولی۔ "ہر ایک کی قسمت اس کے ساتھ ہے"

"اے رقیہ!" بڑی بی ذرا آنکھیں مٹکا کر کہنے لگیں۔ ابھی تو دو اور دو چار دن ہی ہوئے۔ صبر کر لو کسی دن وہ چنے چبوا ئے گی کہ بیٹھی بیٹھی روئے گی اس قسمت کو۔ کبھی سوکن کا نام بھی سنا۔ مار آستین ہے یہ تو۔ بغلی گھونسہ۔ میری بات سن! میں تیری بیری نہیں۔ کوٹھی سے جو نوکر کھانا لینے آئے۔ اسے جوتوں سے ایسا پٹواکہ پھر ادھر کا رُخ بھی نہ

کرے اور جب قمر کے ابا آئیں تو وہ جلی کٹی سنا کہ ہوش ٹھکانے ہو جائیں بس پھر تو ہے اور تیرا راج ہے۔ سن لیا رقیہ!"

رقیہ ہنسنے لگی۔ بڑی بی بولیں۔

"اس وقت تو ہنستی ہو۔ لیکن......"

"لیکن کیا" رقیہ نے بات کاٹ کر کہا۔ "میں تو بڑی بی تم کو بہت سمجھ دار سمجھتی تھی۔ یہ کتھا کیا شروع کر دی تم نے آج"

بڑی بی ذرا ناک بھوں چڑھا کر بولیں۔

"لو اور سنو! ہماری گود میں کھیلی پلی ہمیں ہی عقل سکھانے چلی۔ لے رقیہ! یہ بال دھوپ میں سپید نہیں ہوئے۔ میں نے جو زمانہ دیکھا ہے بس چپ ہی بھلی۔ خدا جنت نصیب کرے وہ بھی ایک چڑیل کہیں سے نکاح کر لائے تھے۔ غضب خدا کا سیدھے گھر میں ہی لے آئے۔ وہ بھی بھیگی بلی کی طرح دبکی دبکی بیٹھی رہتی۔ کچھ روز یونہی گذرے لیکن آخر سوکن بھی لگی پاؤں پھیلانے۔ میں نے پہلے تو زبان سے کام لیا پھر ہاتھا پائی تک نوبت پہنچی۔ وہ خدا کا بندہ جب گھر آتا۔ تو میں ایک طوفان برپا کر دیتی۔ وہ آخر دھول دھپے پر اتر آئے۔ دو ایک روز تو میں نے لحاظ کیا۔ لیکن ایک روز ٹوٹے جوتے سے اس کی وہ چندیا سہلائی کہ اسے گھر سے بھاگتے ہی بنی۔ سارا محلہ اکھٹا ہو گیا۔ اسی

روز اس کٹنی کو گھر سے نکال کر دم لیا۔ رقیہ جو کرنا ہے آج ہی کر لو۔ ورنہ یہ تو عمر بھر کا رونا ہے۔ سوکن کے قدم جم گئے تو تباہی آجائیگی جب بڑی بی کہہ چکیں تو رقیہ بولی۔

"اے بڑی بی! ذرا دل میں تم بھی تو سوچو کہ بگاڑ کس بات پر کروں۔ بات تو اتنی ہی ہے نا کہ قمر کے ابا نے دوسری شادی کر لی ہے۔ کوئی گناہ تو نہیں کیا۔ کوئی جرم بھی نہیں۔ کوئی غیر شرع فعل بھی نہیں۔ اللہ کا فضل ہے۔ آسودگی ہے۔ پھر مذہب تو چار تک کی اجازت دیتا ہے۔ مجھے کھٹکا کاہے کا۔ گھر نہ آیا کریں گے۔ نہ آیا کریں۔ میرا قمر میاں تو میرے پاس ہے۔

بڑی بی کہنے لگیں

"سنتی ہوں بڑی طرحدار عورت ہے۔ رم جھم کرتی کوٹھی میں پھرتی ہے۔ موٹر میں سوار ہو کر سیر سپاٹا کرتی ہے۔ اب کیا کہوں تمہارے رشید میاں سے۔ انھوں نے تو بس لٹیا ہی ڈبو دی خاندان کے نام کو بٹہ لگا دیا۔ تف ہے ایسے مردوں پر۔

"اے بڑی بی!" رقیہ نے ہنس کر کہا "کب تک مغز چاٹو گی یونہی اگر قمر کے ابا خوش ہیں تو میں بھی خوش ہوں"

یہ سن کر بڑی بی بڑبڑاتی ہوئی چلدیں۔

رقیہ حیران تھی کہ اسے خبر تک نہ ہوئی اور ادھر سب سامان بھی ہو گئے۔ کبھی یہ خیال بھی آتا کہ بڑی بی کی تو عادت ہی ہے کہ بات کا بتنگڑ بنایا کرتی ہیں۔ کہیں سے کچھ سن لیا ہو گا۔ لیکن اگلے ہی روز ایک اور ملنے جلنے والی سے بھی یہ بات سنی تو رقیہ سناٹے میں آگئی کوئی جمیلہ تھی جس سے رشید نے شادی کی تھی۔ جمیلہ کے والدین کوئی امیر آدمی نہ تھے۔ باپ پینشنر تھا۔ ملازمت کے بعد لوگوں سے الگ تھلگ ہی رہتا۔ محض نام کا مسلمان تھا مغربی تہذیب اور تمدن کا رنگ بیوی اور بیٹی پر بھی چڑھا ہوا تھا۔ جمیلہ اچھی گوری چٹی رنگت کی تھی۔ ساری پہنتی اور مس جمیلہ کہلاتی۔ انگریزی بھی اچھی جانتی تھی۔ اس پر تو یہ مثال صادق آتی تھی کہ ایک تو کڑوا کریلا دوسرے نیم چڑھا۔ اردو میں بات کرنی بھی پسند نہ تھی۔ ماں کو "ماما" اور باپ کو "پاپا" کہتی۔ پوڈر اور "لپ سٹک" کا ضرورت سے زیادہ استعمال کرتی۔ ڈانس کا بھی شوق تھا۔ وائلن بھی بجانا جانتی۔ نماز روزہ کا تو نام ہی نہ لیجئے۔ پردہ اس کے نزدیک سخت جاہلانہ اور وحشیانہ رسم تھی۔ قرآن حکیم کو الہامی کتاب تو مانتی لیکن اس میں جو قصے مذکور ہیں ان کو محض ڈھکوسلے سمجھتی۔

اس کا باپ کبھی کبھار جو کسی کو چائے پر بلاتا تو جمیلہ خوب

بن سنور کر شامل ہوتی۔ وائلن بھی بجا کر سناتی اور ڈانس بھی دکھاتی میاں رشید سے اس کی ملاقات سینما میں ہوئی تھی۔ ایک دو ملاقاتوں کے بعد جمیلہ کے باپ نے رشید کو چائے پر بلایا۔ پھر تعلقات بڑھنے لگے۔ اور جمیلہ رشید کے ساتھ بلا روک ٹوک سیر کرنے جانے لگی لیکن شام کے بعد۔ آخر ایک روز دونوں میں شادی کی گفتگو چھڑی اور دو ایک روز بعد پانچ ہزار حقِ مہر پر نکاح ہو گیا۔ اور کانوں کان کسی کو خبر تک نہ ہوئی۔

رقیہ اکثر دل میں سوچا کرتی کہ جو ہونا تھا وہ تو ہو چکا۔ اب وضعداری کیسے نبھائے۔ تعلیم و تربیت کا بھی تقاضا تھا کہ صبر اور تحمل سے کام لے۔ کیونکہ دوسری شادی کرنا کوئی جرم تو ہے نہیں جس کے لئے وہ رشید سے بگاڑ پیدا کرے۔ اور جو ایک بار بگاڑ پیدا ہوا تو پھر زندگی تلخ اور گھر کا آرام اور اس کے ساتھ جگ ہنسائی بھی ہوگی۔

چنانچہ رشید جب گھر آتا رقیہ ہمیشہ خندہ پیشانی سے پیش آتی اور کبھی اشارتاً یا کنایتاً بھی اس پر یہ ظاہر نہ ہونے دیتی کہ وہ اس کے راز سے واقف ہے یا اس سے کچھ گلہ ہے۔ ہاں! یہ

خواہش اسے ضرور تھی کہ رشید کسی روز خود ہی یہ ذکر کرے۔ رشید کو رقیہ سے محبت بھی تھی اور وہ اس کی عزت بھی کرتا اور جاگیر کے انتظام کے متعلق بھی اس سے مشورہ کر لیتا۔ اُسے یہ کھٹکا تھا کہ دوسری شادی کی بھنک رقیہ کے کانوں میں پڑ چکی ہو گی۔ لیکن رقیہ کی طرح وہ بھی یہی چاہتا تھا کہ رقیہ ہی اس سے یہ ذکر کرے۔

ایک روز برکھا ہو رہی تھی۔ رقیہ قمر کو گود میں لئے صحن میں کھڑی بادلوں کا نظارہ دیکھ رہی تھی۔ اتنے میں رشید کا موٹر ڈیوڑھی پر آکر رُکا۔ رشید اندر آتے ہی کہنے لگا۔

"بھوک لگ رہی ہے رقیہ! کچھ کھانے کو ملے گا؟"

"اوہو!" رقیہ نے مسکرا کر کہا۔ "تو دوست کے یہاں سے بھوکے ہی آئے۔ باورچی کو رخصت کر دیا کیا؟"

یہ سن کر رشید کی ندامت سے آنکھیں جھک گئیں۔ لیکن وہ ہنس کر کہنے لگا۔

"آج تو اپنی رقیہ کے پاس ہی بیٹھ کر کھاؤں گا۔" یہ کہتے ہوئے اس نے بچّہ گود میں لے لیا اور اس کو پیار کرنے لگا۔ رقیہ بولی۔

"اچھے دوست آئے جو آپ قمر کو بھی بھول گئے۔"

"اوہو!" رشید نے مسکرا کر کہا "آج تو تم ناراض معلوم ہوتی ہو رقیہ؟"

"یہ آپ بات بات پر کیا کہہ دیا کرتے ہیں" رقیہ بولی "میں کیوں خفا ہونے لگی"

"رقیہ!"

"کہئے!"

دونوں کی آنکھیں چار ہوئیں۔ لیکن رشید کی ندامت سے جھک گئیں۔ آخر اس نے کہا۔

"رقیہ میں تمہارا گنہگار ہوں"

"استغفراللہ!" رقیہ نے کہا "یہ آپ کیا کہہ رہے ہیں"

"لیکن تم مجھ پر الزام نہیں دے سکتیں" رشید کہنے لگا "جو کچھ ہوا تمہاری اجازت سے ہوا"

"لیکن یہ بھی تو معلوم ہو کہ ہوا کیا" رقیہ بولی۔

"گویا تمہیں کچھ خبر نہیں" رشید نے کہا "تم سے کسی نے کہا ہی نہیں"

"مجھے الہام تھوڑا ہی ہوتا ہے" رقیہ نے جواب دیا۔

"خیر!" رشید کہنے لگا "مجھ سے واقعی غلطی ہوئی۔ سچ جانو

محض ناتجربہ کاری کی بدولت یہ خفت اٹھانی پڑی۔ لیکن انشاءاللہ اس کا تدارک ہو جائے گا۔

"میں مطلب نہیں سمجھ سکتی!" رقیہ بولی "اگر مجھ سے کہنے کی بات نہیں تو مت کہئے"

"رقیہ!" رشید بولا "کہنے کو تو کئی بار ارادہ کیا لیکن ..... خیر! یہ تو تمہیں معلوم ہی ہو گا کہ میں نے دوسری شادی کر لی ہے"

"اچھا کیا!" رقیہ بولی "لیکن چھپانے کی کیا ضرورت تھی"

"اس لئے کہ تم ناراض ہو گی" رشید نے کہا "تمہیں صدمہ ہو گا"

"ان باتوں کو چھوڑیئے!" رقیہ کہنے لگی۔ "آپ مالک ہیں میں کنیز ہوں۔ مجھے یہ شکوہ نہیں کہ آپ نے دوسری شادی کیوں کی ہاں یہ شکایت ضرور ہے کہ آپ نے قمر کو بالکل بھلا دیا ہے۔ اس کے ساتھ ہی مجھے یہ افسوس بھی ہے کہ وہ عورت جو آپ کی منکوحہ کہلائے بدن کھلے بندوں سیرگاہوں میں گھوما کرے۔ ہر کس و ناکس سے ملا کرے۔ ذرا غور تو کیجئے۔ لوگ کیا کہتے ہوں گے۔ اور پھر ابا جان (خدا انہیں کروٹ کروٹ جنت نصیب کرے) کی روح کو ان باتوں سے کیا صدمہ نہ پہنچتا ہو گا"

"رقیہ!" رشید نے بیوی کی طرف دیکھ کر کہا "کافر ہو جو تمہیں

یا تم کو دم بھر کے لئے بھی بھولا ہو۔ ہاں! کچھ غفلت مجھ سے ضرور ہوئی۔ جس کے لئے میں سخت نادم ہوں۔ باقی رہا جمیلہ کا بے پردا گھر سے نکلنا تو واقعی اس کا تدارک کچھ نہ کچھ ہونا چاہئے۔ میں تم سے وعدہ کرتا ہوں کہ اگر ایک گھنٹہ کوٹھی پر رہوں گا تو دو گھنٹے گھر پر گذاروں گا"

ابھی میاں بیوی میں یہی باتیں ہو رہی تھیں کہ بڑی بی بھی کہیں سے لکڑی ٹیکتی ہوئی آنکلیں اور رشید کو دیکھتے ہی بولیں۔

"واہ میاں!" خوب چھپے رستم نکلے تم تو۔ شرم تو نہ آئی جو غریب رقیبہ پر سوکن لا بٹھائی تم نے۔

"اے بڑی بی!" رقیبہ بولی "خدا کے لئے چپ رہو تم"

"رک جا لڑکی!" بڑی بی بولیں "میں اگر نہ سمجھاؤں گی تو اور کون سمجھائے گا۔ واہ صاحب! چاند ابھی چور و چھوڑ کر اس لونڈری بندریا پر لٹو ہو رہے ہو......"

"اے چپ بھی رہو" رقیبہ نے پھر کہا "دوسری بیوی کرنا کوئی جرم تھوڑا ہی ہے۔ مجھ سے پوچھ ہی کر تو کی ہے۔ میں نے ہی تو اجازت دی تھی"

بڑی بی نے ذرا گھور کر رقیہ کی طرف دیکھا۔ پھر کہنے لگیں سمجھ گئی! ہو نہ ہو یہ سب پیرجی کے تعویذوں کا اثر معلوم ہوتا ہے۔ پھوٹی تیری قسمت رقیہ! جو سوکن نے تعویذ بھی کر ڈالے۔"

"اے بڑی بی!" رشید نے ہنس کر کہا "کیا کہہ رہی ہو تم قسمت پھوٹے رقیہ کے دشمنوں کی۔ جانے تم دل میں کیا سمجھے بیٹھی ہو۔ پوچھ لو رقیہ سے۔ پیسے کی بھی ضرورت ہو تو ان سے مانگ کر لیتا ہوں۔"

"واہ میاں!" بڑی بی نے سر ہلا کر کہا۔ "آپ ہنستے ہیں گویا رقیہ غریب کے زخموں پر نمک چھڑک رہے ہو۔ ذرا دیکھئے تو سہی، رقیہ کی کنول ایسی آنکھوں میں رو رو کر حلقے بھی پڑ گئے۔"

"اے میں کیوں رونے لگی!" رقیہ نے ہنس کر کہا۔ اور رشید اٹھتے ہوئے بولا۔

"بڑی بی! تم ناراض ہوتی ہو تو ہم چلے جاتے ہیں۔"

یہ کہہ کر وہ ہنستا ہوا مردانے میں چلا گیا۔

اس واقعہ کو تین چار مہینے گزر چکے تھے۔ رشید کے وہی لچھن تھے۔ گھڑی دو گھڑی کو آیا بچے کو گود میں لیا، ادھر ادھر کی کوئی بات کی اور چلتا ہوا۔

اسی اثنا میں شہر میں انفلوئنزا پھیلا۔ اور رشید بھی اس میں مبتلا ہوا اب جو وہ پانچ سات روز سے گھر نہ آیا تو رقیہ کو فکر ہوئی چنانچہ ایک روز بڑی بی کو بلوا کر کہا کہ وہ کوٹھی پر جائے اور قمر کے ابا کی خبر لائے۔ ساتھ ہی یہ تاکید بھی کر دی کہ جمیلہ سے بڑی تہذیب اور ادب سے گفتگو کرے۔

بڑی بی جب کوٹھی پر پہنچیں تو اِدھر اُدھر جھانکنے لگیں چوکیدار نے دیکھ کر پوچھا۔

"بڑھیا! کون ہو تم۔ کیا دیکھتی ہو؟"

"میں رقیہ بیگم کی ڈیوڑھی سے آئی ہوں" بڑی بی نے جواب دیا۔ "مجھے اندر جانے کا راستہ دکھا دو۔"

چوکیدار نے اندر جانے کا راستہ دکھا دیا۔ ایک کمرے میں سے گراموفون بجنے کی آواز آ رہی تھی۔ بڑی بی اُدھر کو ہی ہولیں آہستہ سے دروازہ کھول کر جھانکا۔ ایک میز پر گراموفون رکھا تھا سامنے ایک جوان عورت کھڑی رقص کے طور پر قدم اٹھا اور بڑھا رہی تھی بڑی بی چپکے کھڑی تماشہ دیکھنے لگیں۔ لیکن قدِ آدم آئینہ میں سے جمیلہ نے دیکھ لیا اور پلٹ کر پوچھا۔

"کون ہو تم۔ اندر کیوں گھس آئیں"

بڑی بی سمجھ گئیں کہ ہو نہ ہو یہی جمیلہ ہے۔ مسکرا کر بولیں۔

"جمیلہ بیگم!" بیٹی اچھی تو ہو!"

یہ کہتے ہوئے ایک کرسی پر بیٹھ گئیں۔ جمیلہ غصہ سے دروازے کی طرف اشارہ کرکے بولی۔

"چلو اٹھو! نکلو یہاں سے!"

"چھوکری!" بڑی بی ماتھے پر بل ڈال کر بولیں "ذرا تمیز سے بات کر"

چھوکری کا لفظ سن کر جمیلہ کے تو بس پتنگے ہی لگ گئے اور بڑے غصّے سے بڑی بی کی طرف دیکھنے لگی۔ وہ بولیں۔

"کیا دیکھتی ہو میری طرف؟ میں بڑی بی ہوں بڑی بی رقیہ بیگم کے یہاں سے آئی ہوں۔ رقیہ میری گود میں کھیلی ہے۔ دو دن نہ جاؤں تو میری راہ دیکھنے لگتی ہے۔ لا! ذرا شربت تو منگوا پیاس لگ رہی ہے مجھے"

"جمیلہ سمجھ گئی کہ رقیہ نے رشید کی خبر کو بھیجا ہوگا۔ غصے سے بولی۔

"یہاں کیسے آئیں!"

"رشید میاں کو دیکھنے" بڑی بی کہنے لگی "جانے تم نے کیسے تعویذ گنڈے سے بےچارے ...."

لیکن جمیلہ نے بات کاٹ کر کہا۔

"چپ رہو! بیہودہ باتیں مت کرو۔ صاحب کی طبیعت ذرا علیل ہے۔"

رشید صاحب تو بیمار ہیں" بڑی بی نے تنک کر کہا" اور تمہیں ناچنے کی سوجھ رہی ہے ناچنا تو کسبیوں کا کام ہے۔ جمیلہ ہوش کی..."

"چپ رہو" جمیلہ ذرا غصہ سے بولی "مجھے مسز رشید کہو"

"کیا کہوں؟" بڑی بی نے ذرا آگے جھک کر پوچھا"

"مسز رشید!" جمیلہ نے جواب دیا۔

"میں کیا جانوں!" بڑی بی بولی "یہ مسز رشید کس بلا کا نام ہے"

"کیا بک رہی ہو تم" تہذیب سے بات کرو۔ ورنہ ابھی نکلوا دوں گی یہاں سے"

"بکتے تو کوئی تیرے لگتے ہوں گے" بڑی بی نے تنک کر جواب دیا "تو مجھے نوکرانی مت سمجھ! میں بڑی بی ہوں۔ رقیہ نے بلوایا تھا رشید میاں کے اتنے روز نہ جانے سے پریشان ہو رہی تھی۔ مجھ سے منت سے کہا۔ کہ جاؤ ذرا میرے قمر کے ابا کی خبر تو پوچھ آؤ۔ میں تمہارے پاس نہیں۔ رشید میاں کے پاس آئی ہوں۔ ذرا شیشہ لے کر شکل صورت تو دیکھ اپنی۔ کیا رنگ رنگ کی کوچیاں پھیر

رکھی ہیں چہرے پر۔ جانے! رشید میاں تجھ پر کیوں ریجھ پڑے"۔
جمیلہ بھلا ان باتوں کی کب تاب لاسکتی تھی۔ بھنا کر بولی۔
"نکل یہاں سے مردود کہیں کی"
"زبان کو لگام دے چھوکری!" بڑی بی نے بھی غصے سے کہا۔
"ایک کہے گی تو دس سنے گی" تیرے باوا کا گھر نہیں جو نکل جاؤں۔
یہ بھی ہمارے رشید میاں کا گھر ہے۔ جب چاہے آؤں جب چاہے جاؤں۔ میں تیرے باوا کا نہیں کھاتی جو تجھ سے دب جاؤں۔ تیرے کرتب تو مجھے آتے ہی معلوم ہو گئے۔ خوب تعویذ گنڈے کرائے تو نے جو غریب رقیہ کی زبان ہی بند کر دی۔ میں تو رشید میاں سے صاف صاف کہہ دوں گی کہ تجھ ایسی چلتر شریف کے گھر رہنے کے لائق نہیں"
اب تو جمیلہ سے صبر نہ ہو سکا ایک نوکر کو بلا کر کہا کہ اس بڑھیا کو باہر نکال دے اور آئندہ اسے کوٹھی کے احاطے میں قدم نہ رکھنے دے۔ بڑی بی بڑبڑاتی ہوئی چلی آئیں۔

بڑی بی جمیلہ کے ہاں سے اُٹھ کر سیدھی رقیہ کے پاس آئیں اور جو کہا سنا تھا سب کہہ سنایا۔ رقیہ کہنے لگی "میں نے بڑی غلطی کی جو تمہیں بھیجا۔ میں نے تو تم کے آبا کی خبر پوچھنے کو کہا تھا۔ لڑنے کو تو نہیں

کہا تھا۔ افسوس ہے بڑی بی! تمہیں رتّی بھر عقل نہیں۔ قمر کے ابّا سنیں گے تو وہ بھی ناراض ہوں گے۔ اب مت جانا پھر کبھی وہاں!"

"لو جی!" بڑی بولیں "یہ اچھی رہی جس کی خاطر میری فضیحتی ہوئی وہی مجھ سے ناراض بھی ہونے لگیں۔ تجھ سے گلہ نہیں بیٹی! زمانہ ہی ایسا ہے"

"جمیلہ تو یہی سمجھے گی نا" رقیّہ نے کہا "کہ میں نے ہی سکھا پڑھا کر تمہیں بھیجا ہوگا"

"سمجھے گی تو سمجھا کرے فکر کرے تیری پیزار" بڑی بی نے جواب دیا۔

"لو! میں کل ہی پیر جی سے تمہارے لئے کوئی تعویذ گنڈا ایسا لاؤں کہ رشید میاں الٹے پیروں بھاگے آئیں اور تمہارے قدموں پر سر رکھ دیں"

"نہیں"! رقیّہ نے کہا "میرے لئے ہرگز کوئی تعویذ مت لانا میں ان باتوں کی قائل نہیں"

"کیوں!" بڑی بی نے تعجب سے کہا "رقیّہ! وہ تو بڑے کامل مرد ہیں۔ ان کا تعویذ تو کبھی خطا نہیں ہوتا۔ ان کے تعویذ سے تو بے مرادوں کو مرادیں ملتی ہیں۔ اجڑے گھر آباد ہوتے ہیں۔

پانی دم کر دیں تو بیماری دُور ہو جائے۔ پھونک ماریں تو مٹی سونا ہو جائے۔"

"بس رہنے دو" رقیہ بولی۔ "میں اس قسم کے ڈھکوسلے سننا پسند نہیں کرتی۔ ہوتا ہوتا وہی ہے جو اللہ کو منظور ہو۔"

"اے رقیہ!" بڑی بی بولیں "توبہ کر توبہ! اللہ کے ہاں بھی انہی کی سفارش سے کام چلتا ہے۔

پیر جی تو اب اس منزل پر پہنچ چکے ہیں جہاں نماز روزہ بھی معاف ہو جاتا ہے۔"

یہ سن کر رقیہ کو ہنسی آ گئی۔

"اے بڑی بی!" رقیہ بولی۔ خدا کے لئے کبھی عقل کی بات بھی کیا کرو۔ نماز تو انسان کو کسی حالت میں بھی معاف نہیں۔ ایک نماز ہی تو مسلمان کی کھلی پہچان ہے۔ خیر! نہ تو میرے لئے کسی سے کوئی تعویذ گنڈا لانا نہ کہیں میرا ذکر اذکار کرنا!"

کچھ دیر بعد بڑی بی چلی گئیں اور رقیہ سوچنے لگی کہ افسوس اس کم بخت کو بھیج کر اتنا بھی معلوم نہ ہوا کہ قمر کے ابا کو تکلیف کیا ہے اور خفت مفت اٹھانی پڑی۔ عصر کا وقت تھا۔ اس اللہ کی بندی نے اٹھ کر وضو کیا اور نماز پڑھ کر رشید کی صحت اور سلامتی کی دعائیں

مانگنے لگی۔

رشید کی بیماری نے طول کھینچا۔ معیادی بخار تھا۔ ایک وقت شہر سے ایک ڈاکٹر آکر دیکھ جاتا۔ جمیلہ کھڑی کھڑی آتی اور خبر پوچھ کر چلی جاتی۔ ایک نرس تھی جو تیمار داری کرتی تھی۔ جمیلہ کے وہی پھن تھے۔ کلب جانا۔ سینما دیکھنا روز کا معمول تھا۔

رشید یہ سب کچھ دیکھتا تھا لیکن چپ تھا۔ اس نے کئی بار چاہا بھی کہ رقیہ کو بلوا بھیجے لیکن دونوں میں بے لطفی پیدا ہونے کے خیال سے خاموش رہتا۔

ایک روز جو ڈاکٹر رشید کو دیکھ کر آیا تو جمیلہ نے اسے علیحدہ لے جاکر پوچھا۔

"کب تک بخار اترنے کی امید ہے"

ڈاکٹر۔ "کچھ کہا نہیں جاسکتا"

"پھر بھی" جمیلہ نے پوچھا "کوئی ہفتہ تک"

ڈاکٹر۔ "خیال تو ہے"

"اگر آپ کی رائے ہو تو مسٹر رشید کے لئے ہسپتال میں ایک کمرہ لے لیا جائے۔ وہاں زیادہ آرام سے رہ سکیں گے"

ڈاکٹر:" ہرگز نہیں۔ اس حالت میں ان کو ایک جگہ سے دوسری جگہ لے جانا خطرہ سے خالی نہیں۔"

"لیکن وہاں آرام تو بہت ملے گا" جمیلہ بولی "علاج کے لئے ڈاکٹر بھی ہر وقت موجود ہوگا۔"

ڈاکٹر:" آرام یہاں بھی مل سکتا ہے۔ ایک نرس رات کے لئے بھی منگوا لیجئے۔"

"نرس منگوانے سے کیا ہوگا" جمیلہ نے کہا "ہسپتال ہی ٹھیک رہے گا۔"

"لیکن میں اجازت نہیں دے سکتا" ڈاکٹر یہ کہکر چلا گیا۔ جمیلہ نرس سے بولی۔

"میں ہسپتال جاتی ہوں۔ وہاں علیحدہ کمرے کا انتظام کروں گی۔ ہو سکا تو آج ہی ورنہ کل مسٹر رشید کو ہسپتال لے جائیں گے۔

نرس:" لیکن ڈاکٹر تو اس تجویز کے خلاف ہے۔"

"تم کیا جانو!" جمیلہ بولی "ان لوگوں کو تو اپنی فیس کی فکر ہوتی ہے۔"

نرس:" لیکن مسٹر رشید موٹر میں بیٹھنے کے قابل نہیں ہیں۔"

"ہسپتال سے بیماروں کی گاڑی آجائے گی" یہ کہہ کر جمیلہ

چلی گئی۔

جب ہفتہ بھر رقیہ کو شوہر کی خبر نہ ملی تو اس نے بند گاڑی تیار کروائی۔ اور قمر کی انّا اور ایک نوکر کو ساتھ لیا اور سوار ہو کر کوٹھی پر جا اتری۔ رشید کے کمرے کے باہر نرس بیٹھی تھی۔ وہ تعجب سے دیکھنے لگی۔ انّا بولی۔

"آپ رشید میاں کی بیگم صاحبہ ہیں"

نرس یہ سُن کر کھڑی ہو گئی۔ رقیہ نے اس سے ہاتھ ملایا اور پوچھا "جمیلہ بیگم ہیں؟"

نرس "نہیں! وہ تو ہسپتال میں کمرے کا انتظام کرنے گئی ہیں مسٹر رشید کو ہسپتال لے جائیں گی"

"کیا ڈاکٹر نے مشورہ دیا ہے" رقیہ نے پوچھا۔

نرس۔ نہیں! وہ تو اس تجویز کے سخت خلاف ہے"

"کیا میں اندر جا سکتی ہوں؟" رقیہ نے نرس سے پوچھا۔

"ہاں! کیوں نہیں" کہتے ہوئے نرس نے ہولے سے دروازہ کھول دیا"

رقیہ شوہر کے پلنگ کے پاس دبے پاؤں جا کھڑی ہوئی

رشید کو بہت تیز بخار تھا اور وہ دنیا و مافیہا سے بے خبر پڑا تھا۔ پلنگ کے پاس ایک چھوٹی سی میز پر دو ایک شیشیاں رکھی تھیں اور مینٹل پیس پر ایک چھوٹی سی ٹائم پیس رقیہ کے دل کی طرح ٹک ٹک کر رہی تھی۔

رقیہ کچھ دیر شوہر کی طرف دیکھتی رہی پھر ہونے سے نرس سے پوچھا۔

"کس کا علاج ہو رہا ہے"

"شہر سے ایک ڈاکٹر آتا ہے" نرس نے جواب دیا۔

"کوئی انگریز ڈاکٹر کیوں نہ بلوا لیا؟" رقیہ بولی۔

"یہ تو مسز رشید جانیں" نرس نے ذرا مسکرا کر کہا۔

"کب آئے گا ڈاکٹر" رقیہ نے پوچھا۔

"اب تو کل آئے گا ڈاکٹر!" نرس نے جواب دیا۔

رقیہ یہ سن کر کچھ سوچنے لگی پھر بولی۔

"کیا آپ تھوڑی سی تکلیف فرما سکیں گی؟"

"ارشاد" نرس نے جواب دیا۔

"میری گاڑی موجود ہے" رقیہ کہنے لگی۔ "آپ اس میں سوار ہو جائیں اور سول سرجن کو ساتھ سوار کرا لاویں۔ اگر وہ کوٹھی پر موجود نہ ہوں تو آپ ذرا انتظار کر لیں۔

"بہت بہتر" کہہ کر نرس تو چلی گئی اور رقیہ پلنگ کے پاس کرسی

کھینچ کر بیٹھ گئی۔ اور شوہر کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لے لیا۔ جمیلہ کی خادمہ دو ایک بار آئی اور باہر ہی سے جھانک کر چلی گئی۔

*

سائے ڈھل چکے تھے اور آفتاب کی سنہری کرنیں کھڑکیوں کے شیشوں پر پڑ رہی تھیں کمرے میں ہلکی سی سرخی پھیل رہی تھی رقیہ خاموش بیٹھی سوچ رہی تھی کہ دیکھیں جمیلہ کو میرا یہاں آنا ناگوار تو نہیں ہوتا۔ ایک موٹر کوٹھی پر آکر رکی۔ رقیہ سمجھی کہ جمیلہ ہوگی۔ لیکن نرس نے آہستہ سے دروازہ کھول کر ڈاکٹر کے آنے کی اطلاع دی۔ رقیہ کرسی سے اُٹھتے ہوئے بولی۔

"دیکھئے! میں اس ساتھ والے کمرے میں ہو جاتی ہوں پردے کے پیچھے سے بات کر لوں گی"

جب ڈاکٹر آیا تو رقیہ دوسرے کمرے میں ہو گئی۔ ڈاکٹر نے رشید کو اچھی طرح دیکھا بھالا۔ پھر نرس سے کہنے لگا۔

بخار بہت تیز ہے۔ تاہم فکر کی بات نہیں۔

رقیہ نے پردے کے پیچھے سے پوچھا۔

"تکلیف کیا ہے؟"

نرس نے کہا کہ بیگم رشید صاحب بات کرتی ہیں۔ ڈاکٹر کرسی

کھینچ کر پردے کے قریب بیٹھ گیا اور کہنے لگا۔
"میعادی بخار ہے اور کچھ جگر بھی خراب ہے۔ علاج ٹھیک نہیں ہو رہا"
رقیہؔ کہنے لگی۔
"مہربانی فرما کر آپ ہر روز تشریف لا کر دیکھ جایا کریں"
"بہت بہتر" ڈاکٹر نے جواب دیا۔ پھر رقیہؔ نے پوچھا۔
"انہیں اس حالت میں ہسپتال لے جانے کے متعلق آپ کا کیا خیال ہے"
"ہرگز نہیں" ڈاکٹر نے جواب دیا "ان کے لئے حرکت کرنا خطرناک ہوگا"
پھر رقیہؔ نے انا کے ذریعہ سولہ روپے فیس پیش کی۔ ڈاکٹر نسخہ لکھ کر اور نرس کو کچھ ہدایات دے کر چلا گیا۔

جب ڈاکٹر چلا گیا تو رقیہؔ نے نوکر کو دوا منگوانے کے لئے بھیج دیا اور نرس سے کہا۔
"رات کے وقت یہاں کون ہوتا ہے۔؟"
"صرف ایک خادم" نرس نے جواب دیا۔

"آپ عموماً کس وقت تک یہاں رہتی ہیں" رقیہ نے پوچھا۔

"شام تک" نرس نے جواب دیا۔

دونوں میں یہ باتیں ہو ہی رہی تھیں کہ پھر ایک موٹر کوٹھی پر آکر رکی۔ ساتھ ہی قمر کی انّا اندر آئی اور بولی۔

"کوئی مس صاحبہ آئی ہیں"

"جمیلہ ہوں گی" نرس نے جواب دیا۔

پھر "ہیلو کریمی"! یہ جمیلہ ہی تھی۔

پھر رشید کے کمرے کا دروازہ کھلا اور ساتھ ہی۔

"ہیلو نرس!"

لیکن رقیہ کو دیکھ کر جمیلہ دروازے پر ہی کھڑی رہ گئی اور تعجب سے بولی۔

"یہ بی بی کون ہے؟"

جمیلہ ہلکے فیروزی رنگ کی ساری پہنے تھی۔ اسی رنگ کی جرابیں تھیں۔ آستین کے بغیر کھلے گریبان کا جمپر بھی اسی رنگ کا تھا۔ پاؤں میں اونچی ایڑی کی گرگابی تھی۔ کانوں میں آویزے تھے ہاتھ کی کلائی میں بیضوی رنگ کی سونے کی گھڑی تھی۔ ہاتھوں میں دو دو سونے کی خوبصورت کنگنیاں تھیں۔ اور چہرے پر غازے

کی کافی نمائش تھی۔

رقیہ کا لباس بالکل ہندوستانی قطع کا تھا۔ ہلکے گلابی رنگ کی ریشمی شلوار تھی۔ ریشم کی ہی قمیص تھی۔ ہلکے آسمانی رنگ کا پھولدار دوپٹہ تھا۔ کناروں پر گوٹ لگی تھی۔ ہاتھوں میں انگریزی فیشن کی مرصع چوڑیاں تھیں۔ کلائی میں سونے کی ایک بہت خوبصورت گھڑی بھی بندھی تھی اور نازک، گاؤدم انگلیوں میں دو دو قیمتی انگوٹھیاں بھی پڑی تھیں۔ گلے میں ایک بہت خوبصورت سونے کا جواہر نگار ہلکا سا ہار تھا اور کانوں میں جواہر نگار آویزے تھے۔ اور حسن و جمال کا یہ عالم کہ آنکھ اٹھا کر دیکھنے کی جرأت نہ ہوتی۔

رقیہ بولی

"جمیلہ بیگم! میں رقیہ ہوں۔ مجھے افسوس ہے کہ آپ کو اطلاع کئے بغیر آ گئی"

جمیلہ نے کچھ جواب نہ دیا۔ رقیہ نے پھر کہا۔

"اندر آ جائیے"

لیکن جمیلہ وہیں سے نرس سے کہنے لگی۔

"کل ہسپتال سے ایمبولنس کار آ جائے گی۔ مسٹر رشید کا سامان تیار کر رکھنا"

نرس: "سول سرجن ابھی گیا ہے"

"سول سرجن کو بلوایا کس نے؟" جمیلہ نے پوچھا۔

"میں نے!" رقیہ نے جواب دیا "اور اب اسی کا علاج ہوگا"

"لیکن یہ تو کل ہسپتال چلے جائیں گے" جمیلہ نے جواب دیا۔

"ہسپتال کیوں جائیں گے" رقیہ نے پوچھا۔

"وہاں علاج اچھا ہوگا" جمیلہ بولی۔

"علاج یہاں بھی ہوسکتا ہے" رقیہ نے جواب دیا "اور دیکھ بھال میں خود کروں گی"

جمیلہ نے نرس سے مخاطب ہوکر کہا۔

"تم سامان تیار رکھو۔ میں نے کمرہ بھی لے لیا ہے۔"

"جمیلہ!" رقیہ بولی "تمہارے ابا ہسپتال جانے کے قابل نہیں۔ ڈاکٹر بھی تاکید کر گیا ہے کہ یہ آرام سے پڑے رہیں۔ میری موجودگی میں آپ کو ذرہ بھر تکلیف نہ ہوگی۔ یہ ساتھ کا کمرہ میرے لئے کافی ہے۔ کھانا گھر سے پک کر آجایا کرے گا"

"کمرہ تو خالی نہیں" جمیلہ نے جواب دیا۔

"نہ سہی" رقیہ بولی "میں رات کو بھی نہیں پڑی رہوں گی۔ میں خدمت کے لئے آئی ہوں سونے کو نہیں آئی"

"نرس"! جمیلہ بولی "کل سے تمہیں بھی آنے کی ضرورت نہیں صبح تمہاری فیس دے دی جائے گی"
رقیہ نے جمیلہ کی طرف دیکھا اور کہا۔
"آپ کو نرس کی ضرورت ہو یا نہ ہو۔ لیکن مجھے ان کی ضرورت ہے۔ یہ ہر روز آیا کریں گی اور رات کے لئے میں ایک اور نرس کا انتظام کر لوں گی"
"دیکھا جائے گا" جمیلہ نے ناک بھوں چڑھا کر کہا۔
اب نرس سے نہ رہا گیا۔ جمیلہ کی طرف دیکھ کر کہنے لگی۔
"مسز رشید! افسوس آپ کو گفتگو کرنے کا سلیقہ بھی نہیں۔ رقیہ بیگم کس تہذیب اور شائستگی سے آپ سے بولتی ہیں اور آپ کو سیدھے منہ جواب دینا گوارا نہیں۔ پھر اتنی بے مروتی بھی کیا؟ آپ ان کو ایک کمرہ نہیں دے سکتیں۔ حالانکہ یہ کوٹھی مسٹر رشید کی ہے جیسے آپ ان کی بیوی ہیں ویسے یہ بھی ہیں۔ میرا آنا جانا اب بیگم صاحبہ کی مرضی پر ہے۔"
جمیلہ کھری کھری سن کر بڑبڑاتی ہوئی چلی گئی۔
"آپ ہر روز تشریف لایا کریں" رقیہ نے نرس سے کہا "اور کسی ہوشیار نرس کو رات کے لئے بھی آپ ہی مقرر کر دیں"

نرس ہے ہیں حاضر ہوجایا کروں گی۔ اور نرس کا بھی انتظام ہو جائے گا۔"

کچھ دیر بعد نرس چلی گئی۔ لیکن جمیلہ سے اتنا بھی نہ ہوا کہ وہ رقیہ کے لئے کھانا ہی بھجوا دیتی۔

رقیہ نے رات شوہر کے پلنگ کے پاس بیٹھے بیٹھے آنکھوں میں کاٹی۔

اگلے روز صبح صبح ہی ہسپتال سے مریضوں کو لے جانے والی گاڑی آگئی۔

جمیلہ کی خادمہ رقیہ کے پاس آئی اور بولی۔

"بی بی جی! ہسپتال سے گاڑی آگئی ہے۔ آپ ایک طرف ہو جائیں۔"

"تمہیں کس نے بھیجا ہے؟" رقیہ نے پوچھا۔

"میم صاحبہ نے" خادمہ نے جواب دیا۔

"جاؤ ان سے کہو کہ میں ان سے کچھ کہنا چاہتی ہوں" رقیہ نے کہا۔"

نوکرانی چلی گئی اس عرصہ میں نرس آگئی تھی۔ اس نے پوچھا۔

"تو کیا مسٹر رشید ہسپتال جائیں گے؟"

"کیسے جا سکتے ہیں" رقیہ نے جواب دیا۔

اتنے میں نوکرانی واپس آئی اور بولی۔

"بی بی جی! میم صاحبہ کو اس وقت فرصت نہیں۔ وہ صاحب کے ساتھ جانے کے لئے تیار ہو رہی ہیں"

"کہاں ہیں" رقیہ نے پوچھا۔

"چائے پی رہی ہیں" نوکرانی نے کہا۔

رقیہ خود جمیلہ کے پاس گئی۔ وہ بیٹھی چائے پی رہی تھی۔ پاس ہی ایک انگریزی اخبار رکھا تھا۔ پیالی ہاتھ میں تھی اور نظر اخبار پر۔

"میں اندر آ سکتی ہوں؟" رقیہ نے دروازے پر کھڑے ہو کر پوچھا۔

لیکن جمیلہ نے کچھ جواب نہ دیا۔ رقیہ آپ ہی اندر چلی گئی اور جمیلہ کے سامنے کھڑے ہو کر بولی۔

"میں آپ کے پاس آئی ہوں۔ آپ ہسپتال کی گاڑی واپس بھیج دیں"

جمیلہ نے پھر بھی کچھ جواب نہ دیا۔ رقیہ نے پھر کہا۔

"میرا یہاں آنا آپ کو ناگوار تو ہوگا۔ لیکن میں زیادہ عرصہ نہیں ٹھہروں گی صرف قمر کے ابا کی خدمت کے لئے آئی ہوں"

جمیلہ نے کچھ جواب نہ دیا۔
"کل ڈاکٹر آیا تھا" رقیہ نے پھر کہا "اس کی رائے میں قمر کے ابّا کو ہسپتال لے جانا خطرہ سے خالی نہیں"
"میں کیا جانوں" جمیلہ نے پھر وہی خشک سا جواب دیا۔
"تو آپ اجازت دیں تو ہسپتال کی گاڑی واپس بھیج دی جائے" رقیہ بولی۔
"وہ کیوں؟" جمیلہ نے اخبار دیکھتے ہوئے کہا "مسٹر رشید ہسپتال ضرور جائیں گے۔"
"کیسے جا سکتے ہیں" رقیہ بولی "آپ نے کسی سے مشورہ بھی کیا ہے؟"
"مریض کا ہسپتال جا کر رہنا ہی اچھا ہے" جمیلہ نے جواب دیا۔
"ہرگز نہیں" رقیہ نے کہا "آپ مطمئن رہیں۔ میری موجودگی میں آپ کو ہرگز تکلیف نہ ہوگی۔"
"لیکن کسی کے سر پر سوار ہونا بھی تو ٹھیک نہیں" جمیلہ نے پھر اسی انداز سے کہا۔
"یہ آپ نے کیسے جان لیا؟" رقیہ نے پوچھا۔
"معلوم ہوتا ہے" جمیلہ بولی "کہ آپ مجھے کوٹھی سے نکالنا چاہتی ہیں۔"

"یہ آپ کیا کہہ رہی ہیں" رقیہ بولی۔

"اگر مسٹر رشید آپ کے یہاں ہوتے" جمیلہ نے کہا "تو میں ہرگز آپ کے پاس نہ آتی"

"اپنی اپنی مرضی ہے" جمیلہ نے جواب دیا۔

"اپنی اپنی مرضی کیسی؟" رقیہ نے کہا "اپنا اپنا گھر ہے۔

"تو کیا یہ میرا گھر نہیں؟" رقیہ نے پوچھا۔

"ہرگز نہیں" جمیلہ نے جواب دیا "ہاں! آگاہے گاہے دیکھ جانے میں کچھ ہرج نہیں، ہسپتال میں ملاقات کا وقت مقرر ہوتا ہے"

جمیلہ یہ کہہ چپکے سے کمرے سے نکل گئی۔ ادھر رقیہ نے واپس آکر نرس سے کہکر ایمبولنس کار واپس کرادی۔

رقیہ کو کوٹھی میں آئے دو ہفتے ہو چکے تھے۔ دونوں وقت کا کھانا اور دونوں وقت کی چائے گھر سے آجاتی۔

رشید کا بخار اتر چکا تھا۔ لیکن کمزوری بہت تھی۔ ڈاکٹر اب دوسرے روز آتا تھا۔ رقیہ سائے کی طرح شوہر کی خدمت میں حاضر رہتی۔ خدمت بھی کرتی اور دعائیں بھی مانگتی۔ غربا اور مساکین میں خیرات بھی تقسیم کرتی۔ اس تمام عرصے میں اس

نے جمیلہ کے کسی کام میں کبھی دخل نہیں دیا۔ لیکن جمیلہ کچھ اس قدر تنگ خیال تھی کہ جب موقع ملتا رقیہ کی توہین کرنے سے گریز نہ کرتی۔ اس نے رشید کے کمرے میں آنا جانا بالکل ترک کر دیا تھا۔ اس کے وہی لچھن تھے۔ صبح و شام موٹر پر سوار ہو کر ہوا خوری کرنا رات کو سینما دیکھنا۔ کلب جانا۔ اور رات گئے واپس آنا۔

رشید اخراجات کے لئے ہمیشہ رقیہ سے روپیہ لیا کرتا تھا چنانچہ اسی خیال سے رقیہ نے جمیلہ کے پاس دو بار سو سو روپیہ بھیجا۔ لیکن اس نے لینے سے انکار کر دیا۔

رشید یہ سب کچھ دیکھتا تھا اور رقیہ کا ایثار اور خدمت دیکھ کر نادم ہوتا تھا۔ آخر پورے ایک مہینے بعد رشید نے غسلِ صحت کیا رقیہ اسی روز سوار ہو کر اپنے گھر آگئی۔ اور آتے ہی شوہر کے غسل صحت کی خوشی میں خیرات تقسیم کی۔ پچھلے پہر رشید بھی موٹر میں سوار ہو کر آیا۔ اور آتے ہی قمر کو گود میں لے لیا۔ رقیہ نے آج بہت اچھا لباس پہنا تھا۔

رشید ہنس کر بولا۔

"رقیہ! آج تو تم بہت خوش خوش نظر آتی ہو"

"خدا نے آپ کو نئی زندگی جو بخشی ہے" رقیہ نے مسکرا کر کہا۔

"میرے لئے اس سے زیادہ مبارک اور کون سا دن ہوگا"

"ماما نے ابھی ابھی مجھ سے کہا تھا"، رشید نے کہا، "کہ تم سہیلیوں کی دعوت کرنے والی ہو"

"ہاں!" رقیہ نے جواب دیا۔ "انشاءاللہ کل پرسوں دعوت کرنے کا ارادہ تو ہے۔"

"تو پھر کچھ ہمیں بھی دلوایئے" رشید نے ہنس کر کہا۔

رقیہ مسکرا کر شوہر کی طرف دیکھنے لگی۔ رشید نے ہنس کر کہا۔

"پانچ ہزار سے کم نہ لیں گے"

"کل لے لیجئے" رقیہ بولی "آج تو منشی جی چلے گئے"

"بہت اچھا" رشید بولا "کل سے رشید بھی بس تمہارا ہی ہوگا۔"

رقیہ تعجب سے شوہر کی طرف دیکھنے لگی۔ اس نے جیب سے ایک کاغذ نکال کر بیوی کو دکھایا اور کہا۔

"رقیہ یہ دیکھو! جمیلہ کو کل سے طلاق ہے۔ کل مہر کے پانچ ہزار اس کاغذ کے ساتھ وکیل کے ذریعہ اسے بھیج دوں گا۔

"لیکن اس کی کچھ خطا بھی" رقیہ نے پوچھا۔

"خطا!" رشید نے کہا "خدا کی قسم جو تجربہ مجھے حاصل ہوا ہے اس نے میری آنکھیں کھول دی ہیں" "رقیہ! تم ایسی عورت کی عزت

اور قدر نہ کرنا کفرانِ نعمت ہے۔ جو ہوا سو ہوا اب خدا کے لئے اور اپنے قمر میاں کے لئے میری خطا معاف کردو"

رقیہ کی آنکھوں میں آنسو بھر آئے۔

بیٹی

"تو بگاڑ کیسے ہوا؟" بڑی بی نے ذرا سنجیدہ صورت بنا کر پوچھا۔ "مجھ سے نہ کہو گی بیٹی؟"

رضیہ ایک آہ بھر کر بولی۔

"بات جب یاد آتی ہے تو رنج تو ضرور ہوتا ہے۔ لیکن تجھے وہ بھی سنیے"

"وہ بچی!" بڑی بی نے ذرا سر ہلا کر کہا۔ "تم تو بجھارتیں بجھاتی ہو۔ کچھ صاف کہو تو پتہ بھی چلے"

بڑی بی ایک دقیانوسی عورت تھیں۔ لڑکیاں بالیاں ان کی

باتیں بہت شوق سے سنا کرتیں۔ بڑی بی گو سیدھی سادھی سی تھیں لیکن تھیں منھ پھٹ۔ چھوٹا ہو یا بڑا بات کہنے کی ہو یا نہ ہو۔ لیکن وہ بڑی بی ہی کیا جو کہے بن رہیں۔ جو منھ میں آتا چوپٹ کہہ دیتیں۔ لیکن تھیں ملنسار۔ بڑی بی کی تو وہ بات تھی کہ ع

"سارے جہاں کا درد ہمارے جگر میں ہے"

دنیا بھر کے کام ان کے ذمے ہوتے۔ جہاں کسی نے جانے کو کہا۔ وہیں اٹھ بھاگیں۔ جس نے بلایا اسی کے پاس جا بیٹھیں رضیہ کے میکے والوں سے بہت میل ملاپ تھا۔ ایکا ایکی رضیہ شوہر کے یہاں سے اٹھ کر میکے آ بیٹھی تھی۔ بڑی بی کو یہ معلوم کرنے کی کرید لگی رہتی کہ شوہر سے اَن بَن کیوں ہوئی۔ آج بہت روز بعد جو رضیہ سے ملنے آئیں تو پھر وہی ذکر لے بیٹھیں۔

رضیہ نے کہا۔

بڑی بی! یہ کوئی قصہ کہانی تو نہیں۔ میری قسمت کا دکھڑا ہے تم سن کر کیا کرو گی؟

بڑی بی نے جواب دیا۔

"رضیہ بیٹی! عمر سے تم ایک بچّی کی ماں تو ہو گئیں لیکن عقل سے

کوری ہی رہیں۔ دکھ درد زبان سے کہنے سے دل کی بھڑاس نکل جاتی ہے۔ غم کا بار ہلکا ہو جاتا ہے۔"

رضیہ جتنا گریز کرتی بڑی بی کا اصرار اتنا ہی زیادہ ہوتا جاتا۔ اتنے میں ماما ایک طشتری میں چھالیا رکھ لائی۔ رضیہ طشتری بڑی بی کی طرف سرکا کر بولی۔

"اے بڑی بی! بیکار بیٹھی کیا کرتی ہو۔ یہ چھالیا تو ذرا کاٹ ڈالو۔ لیکن ذرا باریک باریک کاٹنا۔

"ہاں!" بڑی بی نے سروتا اُٹھاتے ہوئے کہا۔ "یہ ٹھیک ہے میں چھالیا کاٹتی ہوں تم ذرا یہ قصہ کہہ دو۔ خوب وقت کٹے گا۔"

"اے توبہ!" رضیہ ہنس کر بولی "تمہیں تو بات کبھی بھولتی ہی نہیں۔"

"بھولے کیسے؟" بڑی بی نے طشتری میں سے ایک چھالیا اٹھاتے ہوئے کہا۔ "دوسرے کے دُکھ کی سن کر اپنا دکھ یاد آجاتا ہے۔ تو گویا اب میل ملاقات بالکل ہی بند ہے۔ یہی بات ہے نا بیٹی؟"

"ہاں!" رضیہ نے جواب دیا "بند ہی ہے"

"اور بچی کو بھی بھول گئے!" بڑی بی نے نجمہ کی طرف جو ماں کے پاس بیٹھی کھیل رہی تھی دیکھتے ہوئے پوچھا۔

"نہیں تو!" رضیہ نے بیٹی کی طرف محبت بھری نگاہوں سے

دیکھتے ہوئے کہا۔" اسے تو دوسرے تیسرے بلوا بھیجتے ہیں"۔

"چھوڑو بیٹی! ان مردوں کا خون تو ایسا سپید ہوتا ہے کہ بس توبہ ہی بھلی۔ خبردار رہیو! کہیں چھین ہی کر نہ لے جائیں"۔

رضیہ ہنس کر بولی۔

"بڑی بی! کہیں سٹھیا تو نہیں گئیں تم؟ چھین کر تو لے جائیں جو میں بچّی کو باپ سے ملنے نہ دوں"

"ہاں!" بڑی بی سر ہلا کر بولی "کہتی تو تم بھی ٹھیک ہو۔ تاہم یہ نگوڑا وقت تو اب مشکل ہی سے کٹتا ہوگا"۔

"وہ کیوں؟ رضیہ بولی "میری نجمہ جو ہے میرے پاس۔ مجھے تو اسی کے کام دھندے سے فرصت نہیں ملتی۔ کہیں نہلانا ہے کبھی کپڑے پہنانے ہیں۔ کھانا۔ پلانا۔ لاڈ۔ پیار۔ آنکھ جھپکتے ہیں دن گذر جاتا ہے۔ پھر یہ محلے کی لڑکیاں بھی آ بیٹھتی ہیں۔ کوئی قرآن شریف پڑھتی ہے۔ کوئی سینا پرونا سیکھتی ہے۔ مجھے تو دن بھر انہی دھندوں سے فرصت نہیں"۔

نجمہ نے جو دو چار بار اپنا نام سنا تو اٹھ کر ماں کی گود میں آ بیٹھی رضیہ نے بھینچ کر بچی کو سینے سے لگا لیا اور کہا۔

"بلا سے!" ابا نہیں آتے تو نہ آئیں۔ میری نجمہ تو میرے پاس ہے۔ غصہ بھی تو انہیں اسی بات کا ہے کہ ہم دونوں ماں بیٹی کیوں نہ جل مریں۔"

"یہ کیا کہا تم نے رضیہ؟" بڑی بی نے آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر رضیہ کی طرف دیکھتے ہوئے پوچھا۔

"جل مریں تمہارے دشمن"

اور رضیہ مسکرا کر بولی

"تو اور کیا! ناراضگی بھی تو یہی ہے۔ خفا بھی تو اسی لئے ہیں۔"

"بڑے متلوّن مزاج ہوں گے۔" بڑی بی بولیں "جہنم بنا رکھا ہوگا گھر تمہارے لئے۔"

"نہیں!" رضیہ نے جواب دیا "نجمہ کے ابّا تو بڑے حلیم الطبع آدمی ہیں۔"

"ٹھیک ہے!" بڑی بی "یہ کوئی نئی بات نہیں۔ بلا سوچے سمجھے شادی کرنے کا عموماً یہی نتیجہ ہوا کرتا ہے۔

رضیہ! تم نے بھی "آگا دیکھا نہ پیچھا۔" لیکن یہ تو تمہاری دوسری شادی تھی؟"

"ہاں دوسری!" رضیہ نے ایک آہ بھر کر کہا "کسی سے کیا

شکوہ! نصیب ہی کچھ ایسے لے کر آئی ہوں کہ دو گھڑی کا سکھ بھی میسر نہیں۔ خدا جنّت نصیب کرے (پہلا شوہر) اس غریب کے گھر تو جانا بھی نصیب نہ ہوا۔ نکاح کے بعد رخصتی میں ہی تین سال گذر گئے۔ اس اثنا میں شہر میں وبا پھیلی اور وہ اللہ کو پیارے ہو گئے۔ لو یہ تو رہا پہلی شادی کا قصّہ! نہ سسرال دیکھی نہ شوہر سے بات کرنی نصیب ہوئی اور بیوگی کا ٹیکہ ماتھے پہ لگ گیا۔ خدا ابّا جان کو کروٹ کروٹ جنّت نصیب کرے جنہوں نے بڑی توجہ سے مجھے لکھوایا پڑھوایا۔ ورنہ یہ نگوڑی زندگی تو آج موت سے بھی بدتر ہوتی۔ کوئی سال بھر نصیب جلی۔ منحوس۔ ڈائن سیاہ بخت۔ رانڈ سبھی کچھ کہلوایا۔ لیکن آخر تنگ آمد بجنگ آمد! پھر جو کسی کی زبان سے کوئی ایسا کلمہ نکلا تو اسے وہ ڈانٹ بتلائی کہ پھر کسی کو کچھ کہنے کی جرأت نہ ہوئی۔ بھلا کوئی پوچھے تو سہی میں منحوس کیسے ہوئی کیا شہر میں وبا میرے کارن آئی۔ خدا رحم کرے ہمارے ملک کی عورتوں پر۔ میری سہیلی کلثوم خدا اسے اپنے جوارِ رحمت میں جگہ دے۔ اپنے گھر میں آباد تھی شادی ہو جانے کے بعد وہ مجھ سے اکثر ملنے آیا کرتی تھی۔ اس کے میاں بھی اس کے ساتھ آیا کرتے تھے۔ بڑے ہی شریف

آدمی تھے ہیں اُن سے کچھ برائے نام ہی پردہ کرتی تھی۔ اور...."

لیکن بڑی بی بات کاٹ کر بولیں۔

"اے بیٹی! یہ کیا کہا تم نے! تم غیر مرد سے پردہ نہیں کرتی تھیں کسی نے مت بھی نہ دی تمہیں بیٹی! پردہ تو عورت کی زینت ہے میں پوچھتی ہوں ایک غیر محرم کے سامنے ہونے کی تمہیں جرأت کیسے ہوتی تھی۔ اللہ رحم کرے! اس نئی پود کی لڑکیوں کے پچھن دیکھ دیکھ کر میرے تو رونگٹے کھڑے ہوتے ہیں۔ پردے سے کچھ یوں متنفر نظر آتی ہیں۔ جیسے یہ بھی کوئی وبا ہے کہ چھوئے اور مرے! پھر ان مردوں کی غیرت تو دیکھو۔ کیا بے حیائی سے گھر والیوں کو مجمع عام میں لئے پھرتے ہیں کہ لو! دیکھ لو بھائی ہے نا اندر کے اکھاڑے کی پری۔ پھر اسی پر بس نہیں۔ میاں گھر پر نہ ہوں تو میم صاحبہ میاں کے دوستوں سے یوں ملتی ہیں گویا ماموں جی ہی تو ہیں۔ توبہ ہے میری توبہ! یہ اندھی تقلید تو مسلمانوں کو لے ڈوبے گی ایک روز۔ اللہ اپنی پناہ میں رکھے کہو نا بیٹی تم بھی آمین!"

رضیہ بولی۔

"جو کچھ تم کہتی ہو سب سچ ہے۔ اس ملک میں جہاں ہمیں

غیر اقوام سے واسطہ پڑتا ہے۔ ہم مسلمانوں کے لئے پردہ بہت ضروری ہے۔ لیکن کلثوم کے میاں تو میرے لئے غیر محرم نہ تھے رشتے میں میرے بھی بھائی ہوتے تھے۔"

"اچھا!" بڑی بی اس اچھا کو خوب لانبا کرکے بولیں۔ "تو پھر ان سے پردہ کرنا تو واقعی ضروری نہ تھا۔ بھائی سے کیسا پردہ۔ تو خیر! وہ تمہارے گھر آیا کرتے تھے۔ پھر کیا ہوا؟"

رضیہ بولی۔

"شادی کے کچھ عرصہ بعد اللہ میاں نے کلثوم کی گود بھر دی۔ اور اسے ایک چاند سی بیٹی عطا کی۔ بچی کا نام طاہرہ رکھا گیا۔ دونوں میاں بیوی بچی پر جان چھڑکتے تھے۔"

اور بڑی بی نے مسکرا کر کہا۔

"کیسے نہ چھڑکتے۔ جگر کا ٹکڑا تھا۔ تو خیر! پھر ہوا کیا؟"

رضیہ بولی۔

ابھی طاہرہ تین ایک سال کی ہی تھی کہ کلثوم اللہ کو پیاری ہوئی۔ ماں کے مرنے کے بعد طاہرہ اپنے ننھیال چلی گئی۔ طاہرہ کے ابا کاروباری آدمی تھے۔ انہیں اکثر شہر سے باہر جانا پڑتا تھا۔ لیکن جب لوٹ کر آتے تو بیٹی کو جان سے لگائے رکھتے۔ ادھر

مجھے بیوہ ہوئے تین برس ہو چکے تھے۔

کلثوم کے مرنے کے بعد طاہرہ کے ابا کا ہمارے یہاں آنا جانا بہت کم ہو گیا تھا۔ اور جو آتے بھی تو بس مرحومہ کا ذکر اذکار ہی کیا کرتے۔

ساون رت تھی۔ کچھ بوندا باندی سی ہو رہی تھی کہ ماما نے ان کے آنے کی اطلاع دی۔ وہ آئے تو اماں کے پاس پیڑھی پر بیٹھ گئے۔"

"وہ کون؟" بڑی بی نے رضیہ کی طرف دیکھتے ہوئے پوچھا۔

"طاہرہ کے ابا!" رضیہ نے جواب دیا۔

"وہ تو گویا!" بڑی بی سر ہلا کر بولیں "تم کلثوم کے شوہر کا ذکر کر رہی ہو"

اور رضیہ نے ہنس کر کہا۔

"بڑی بی! سوتی ہو یا جاگتی؟"

"اچھا! اچھا!" بڑی بی کھنکار کر بولیں "تو وہ تمہاری امّی جان کے پاس پیڑھی پر بیٹھ گئے۔ کوئی کرسی ورسی نہ تھی۔ یا شاید تمہاری امی بھی پیڑھی پر ہی بیٹھی ہوں گی"

رضیہ مسکرا کر بولی۔

"وہ بیٹھے بیٹھے میری طرف بھی دیکھ لیتے۔ میں اُٹھ کر کوٹھے پر چلی گئی۔ لیکن تھوڑی ہی دیر بعد اماں نے آواز دے کر مجھے نیچے بلوالیا۔ میں نیچے آئی تو وہ کسی کام کے بہانے پاس سے اُٹھ کر دوسرے کمرے میں چلی گئیں۔ طاہرہ کے ابا ہنس کر بولے۔

"رضیہ! تم چلی کیوں گئی تھیں؟"

"ایسے ہی! میں نے زیرِ لب مسکراتے ہوئے کہا۔" طاہرہ تو اچھی ہے۔"

"بہت محبت ہے تمہیں طاہرہ سے" انھوں نے پوچھا۔

"ہے تو سہی"! میں نے جواب دیا۔

"سچ؟" انہوں نے مسکرا کر پوچھا۔

"جو کچھ بھی آپ سمجھیں!" میں نے زیرِ لب مسکراتے ہوئے کہا۔

انہوں نے میرا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لیتے ہوئے پوچھا۔

"تم طاہرہ کی ماں بنو گی"

میں نے شرما کر سر جھکا لیا۔ وہ کہنے لگے "رضیہ! تم ماشاءاللہ تعلیم یافتہ ہو۔ حجاب کیسا میری بات کا جواب دو۔"

"امی سے کہئے!" میں نے دبی زبان سے کہا۔

انہوں نے میرا ہاتھ چھوڑ دیا۔ کچھ دیر بعد وہ چلے گئے۔ دو

ایک روز بعد ان کے کنبے میں سے ایک عورت آئی اور میرے لئے ایک قیمتی جوڑا اور کچھ زیورات لائی اور ان کی طرف سے یہ پیغام دیا کہ نماز مغرب کے بعد نکاح ہوگا۔ چنانچہ میرے کنبے کی عورتوں نے اسی روز مجھے بنا سنوار کر دولھن بنا دیا۔ مغرب کے بعد وہ پانچ سات عزیزوں کے ساتھ آئے اور پانچ ہزار حق مہر پر میرا ان سے عقد ہوگیا۔ کھانے کے بعد مجھے رخصت کروا کر موٹر میں بٹھا کر گھر لے آئے۔ میرا نیا گھر کوٹھی نما تھا۔ اس کی دو منزلیں تھیں۔ یوں سمجھو کہ نیچے کا حصہ تو کوٹھی کی طرز کا تھا اور اوپر کی منزل پردہ دار تھی۔ دو نوکر تھے۔ ایک ماما تھی۔ کھانا باورچی پکاتا تھا۔ مکان خوب سجا ہوا تھا۔ سواری کے لئے موٹر تھی۔ شام کے بعد مجھے موٹر میں بٹھا کر ہوا خوری کو لے جاتے۔ بلا ناغہ طاہرہ کو دیکھنے جاتے۔ طاہرہ سے اتنی محبت تھی کہ اس کی باتیں کرتے اور ہنستے۔ مجھے اس نئے گھر میں کوئی مہینہ ڈیڑھ مہینہ ہوا تھا کہ ایک روز کہنے لگے کہ رضیہ! تم کہو تو میں اب طاہرہ کو بھی لے آؤں؟"

میں نے ہنس کر جواب دیا کہ بھلا یہ بھی کوئی پوچھنے کی بات تھی۔ مجھے تو خود تعجب ہے کہ آپ بچی کو ابھی تک لائے کیوں

نہیں۔" تو آج ہی لے آؤں؟" انہوں نے ہنس کر پوچھا۔ "آج کیوں؟" میں نے کہا۔ "ابھی موٹر لے کر جائیے اور سوار کرا لائیے۔ میں آپ کے آتے آتے ایک کمرہ طاہرہ کے لئے تیار کئے دیتی ہوں۔"

میرا اتنا اشتیاق دیکھ کر وہ بہت خوش ہوئے۔ اور اسی وقت سوار ہو کر چلے گئے۔ ادھر وہ گئے اور میں نے نوکرانیوں کے ساتھ مل کر اپنے سونے والے کمرے کے ساتھ کا کمرہ جو ہوادار بھی تھا تیار کر دیا۔ اور باورچی سے کہلا بھیجا کہ اچھی اچھی چیزیں تیار کرے۔ اور نوکر کو بھیج کر بازار سے پھل اور مٹھائی بھی منگوا لی۔

جب وہ طاہرہ کو ساتھ لے کر آئے تو میں بھاگی بھاگی نیچے گئی اور موٹر کا دروازہ کھول کر طاہرہ کو اندر سے نکالا۔ اور گود میں اٹھا کر اوپر لے آئی پھر پھل اور مٹھائی اس کے سامنے رکھی لیکن اس اللہ کی بندی نے کسی چیز کو ہاتھ "تک" نہ لگایا۔ جب اس کے ابا اوپر آئے تو وہ ان کی گود میں جا بیٹھی۔ وہ کہنے لگے طاہرہ! اب تم انہیں آپا کہا کرو۔ انہیں بھی تم سے بہت محبت ہے۔ تو خیر! دس بیس روز میں طاہرہ مجھ سے کچھ مانوس ہو ہی گئی

وقت اسی طرح گذرتا گیا۔ لیکن جانے کیا بات تھی کہ باوجود پیار محبّت کے طاہرہ کچھ مجھ سے کھنچی کھنچی ہی رہتی۔ اسے دیکھ دیکھ کر مجھے کلثوم یاد آتی۔ مجھ سے جہاں تک بن پڑتا اس سے محبت کرتی اور اس کے چاؤ چونچلوں میں لگی رہتی۔ وہ کہتی تو مجھے آپا ہی لیکن جب اس کے ابّا گھر میں ہوتے تو ایسا معلوم ہوتا گویا وہ مجھے جانتی ہی نہیں۔ اسی اثنا میں اس کی نانی امّاں کا انتقال ہو گیا۔ وہ چاہتے تھے کہ طاہرہ کو بھی ساتھ لے جائیں۔ لیکن میں نے کہا کہ ایک تو بچّی پہلے ہی کچھ اداس اداس سی رہتی ہے۔ ماتم والے گھر جائے گی تو اور بھی سہمی رہے گی۔ لیکن جب طاہرہ سے پوچھا تو وہ باپ کے ساتھ جانے کو تیار ہو گئی وہ ساتھ لے گئے لیکن شام کو واپس لے آئے۔ میں نے آتے ہی اسے گود میں لے لیا۔ لیکن وہ کچھ گم سُم سی بیٹھی رہی۔ میں نے ہنس کر پوچھا۔

طاہرہ! تمہیں ابّا سے پیار ہے یا مجھ سے؟"

"ابّا سے!" اس نے ہولے سے کہا۔

"مجھ سے پیار نہیں"؟ میں نے پوچھا۔

وہ چپکی ہو رہی۔ اتنے میں اس کے ابّا آ گئے۔ انہوں نے ہنس کر پوچھا۔

"کیا باتیں ہو رہی تھیں؟"

میں نے کہا کہ میں طاہرہ سے پوچھتی تھی کہ تمہیں مجھ سے پیار ہے یا اپنے ابا سے۔ انہوں نے پوچھا۔

پھر کیا کہا میری طاہرہ نے۔ میں نے کہا کہ آپ ہی پوچھ لیجئے انہوں نے بچی سے پوچھا۔

"کیوں طاہرہ؟" انھوں نے پوچھا" تم ہماری بیٹی ہو یا اپنی آپا کی"

"آپ کی!" طاہرہ نے جھٹ جواب دیا۔ یہ کہنے کے ساتھ وہ اُچک کر ان کی گود میں جا بیٹھی۔ وہ اُسے پیار کرتے ہوئے بولے۔

"بچی ہی تو ہے۔ مانوس ہو جائے گی۔"

میں مسکرا کر چپکی ہو رہی۔ بڑی بی بولیں۔

"بڑی ضدن لڑکی تھی۔ تمہیں سوتیلی ہی سمجھتی ہو گی۔"

"نہیں!" رضیہ نے جواب دیا" باپ سے بہت زیادہ مانوس تھی۔ تو خیر اسی طرح وقت گذرتا گیا۔ شادی سے دو سال بعد اللہ نے مجھے میری نجمہ دی۔ اب تو طاہرہ کی دنیا ہی بدل گئی۔ دن بھر نجمہ کو گود میں لئے کھلاتی اور اس سے بے حد پیار کرتی۔ ایک روز میں نے طاہرہ سے پوچھا۔

"طاہرہ! تمہیں نجمہ سے کتنا پیار ہے"
وہ مسکرا کر بولی
"بہت"
"اور مجھ سے" میں نے پوچھا۔ لیکن وہ مسکرا کر چپ ہو رہی پھر بھی وفورِ محبت سے میں نے اسے گود میں لے لیا۔"

"انہی ایام میں شہر میں ایک تھیٹر آیا۔ اور"
"یہ تھریٹر کیا بلا ہوتی ہے" بڑی بی نے پوچھا۔
"تھیٹر تماشہ کو کہتے ہیں۔ جس میں قصّے کہانیاں سچ بنا کر دکھائی جاتی ہیں" رضیہ نے جواب دیا"
"تو تم بھی یہ تھریٹر دیکھنے گئیں؟" بڑی بی نے پوچھا۔
رضیہ بولی
"تھریٹر نہیں تھیٹر کہو"
اس پر بڑی بی بگڑ گئیں اور بسورنا چھوڑ کر بولیں۔
اللہ کا نام لے بیٹی! میں کوئی کرسٹان تھوڑی ہوں نہیں جو ناپاک الفاظ بھی میری زبان سے ٹھیک نکلیں"
رضیہ نے ہنس کر پوچھا۔

"یہ ناپاک الفاظ کیسے ہو گئے؟"

"ناپاک نہیں تو اور کیا!" بڑی بی نے ناک سکوڑ کر کہا۔ "کریانی لوگ جیسے خود ناپاک ویسے ان کی زبان بھی ناپاک!"

"بس! رضیہ نے ہنس کر کہا۔" اسی پرتے پر یہ تتا پانی۔ یہ تمہارے کریانی بھی تو اہل کتاب ہی ہیں۔ تم نے انہیں ناپاک کیسے کہدیا؟"

"ناپاک نہیں تو اور کیا" بڑی بی نے جواب دیا۔ "میں نے سنا ہے یہ لوگ اپنے کتوں کا منہ بھی چاٹ لیا کرتے ہیں۔ بیٹی! میں تو تمہیں بہت سمجھ دار سمجھتی تھی۔ لیکن تمہیں تو شاید یہ بھی معلوم نہیں کہ جس گھر میں کتا رہتا ہے وہاں فرشتے بھی نہیں آتے۔"

رضیہ ہنس کر بولی۔

"اور یہ جو شہر میں سینکڑوں کتے چلتے پھرتے ہیں تمہارے کہنے کے مطابق تو پھر اس شہر میں بھی فرشتوں کا گذر نہ ہوتا ہوگا؟"

"تو اس میں شک ہی کیا ہے" بڑی بی نے جواب دیا۔ "اگر فرشتے اس شہر میں آتے تو یہ آئے دن ہیضہ۔ طاعون۔ بخار۔ پر سوت وغیرہ کی شہر میں کیوں شکایت ہو۔ لیکن مشکل یہ ہے کہ تم نے عربی کی کوئی کتاب ہی نہیں پڑھی۔ تم یہ مسائل کیا جانو۔ تو خیر شہر میں وہ تمہارا تھیر ٹیر آیا۔ (تھوک کر) ہائے توبہ! بار بار ناپاک لفظ

زبان پر آنے سے وضو بھی ٹوٹ گیا"

"تو گویا! رضیہ نے ہنس کر کہا" غیر زبان کا لفظ زبان پر آنے سے وضو بھی ٹوٹ جاتا ہے۔ اے بی عاقلہ! یہ باتیں کہاں سے سن رکھی ہیں تم نے"

"بیٹی!" بڑی بی بولیں "یہ بال دھوپ میں سفید نہیں کئے ہیں نے۔ لیکن تم یہ بحث چھوڑو۔ تو خیر! وہ "راس" ڈالنے والے تمہارے شہر میں آئے پھر ہوا کیا؟"

رضیہ بولی۔

"نجمہ کے ابا بھی ایک ......"

لیکن! بڑی بی بات کاٹ کر بولیں۔

"چلو! طاہرہ سے نجمہ کے ابا ہو گئے۔ گویا طاہرہ یتیم اب بھلا دی گئی تھی..... اللہ کی مرضی! نہ غریب کی ماں مرتی نہ یوں ....."

لیکن اب رضیہ نے بات کاٹ کر کہا۔

"محض پگلی ہو تم۔ سو بار کہہ چکی کہ طاہرہ تو مجھے نجمہ سے بھی پیاری تھی۔ لیکن تمہارے تو سر میں جانے بھُس بھرا ہے

بڑی بی ناک سکوڑ کر بولیں۔

"اب لگیں گھر بلا کر صلواتیں سنانے! اچھا بیٹی! خدا بھلا کرے

کچھ اور بھی کہہ لو"

رضیہ نے ہنس کر کہا۔

"بڑی بی! یہ پارہ کیوں چڑھنے لگا بیٹھے بیٹھے! کہیں عقل گھاس چرنے تو نہیں گئی"

"اے لو!" بڑی بی نے غصے سے کہا۔ "یک نہ شد دو شد۔ گالی پر گالی۔ لیکن یہ تمہارا قصور نہیں۔ یہ سب مدرسوں کی تعلیم کا اثر ہے کہ چھوٹوں کے دیدوں سے بڑوں کا ادب اٹھا چلا جاتا ہے۔ ہزار بار کہا لاکھ بار سمجھایا کہ لڑکیوں کو تعلیم مت دلواؤ۔ لیکن غریب کی سنتا ہی کون ہے۔ چلو! اب اس کتھا کو ختم بھی کرو!"

رضیہ بڑی بی کی طبیعت سے واقف تھی مسکرا کر چپ ہو رہی بڑی بی بولیں۔

"توبہ ہے! کان پک گئے سنتے سنتے! یہ کہانی اب ختم بھی ہو گی اے خدا کے لئے اب کچھ بولو بھی"

رضیہ کو ہنسی آ گئی۔ بڑی بی بولیں

"یوں ہنسنے سے کیا فائدہ۔ ذرا کھل کر ہنسو تو اڑوسن پڑوسن کو بھی معلوم ہو کہ بڑی بی کی فضیحتی ہو رہی ہے"

"اے بڑی بی!" رضیہ نے ہنسی ضبط کرتے ہوئے کہا "کیوں ناراض ہو رہی ہو مفت میں" بگڑنے کی بات ہو تو تم بگڑو بھی۔ واہ! اچھا انعام دیا تم نے"

"بیٹی!" بڑی بی بولیں۔ دعاؤں کے سوا میرے پاس اور کیا ہے جو تمہیں دوں۔ اچھا! تو پھر ہوا کیا؟"

رضیہ کہنے لگی۔

"ایک رات طاہرہ کے ابّا بھی تماشہ دیکھنے گئے......"

"شاباش بیٹی!" بڑی بی پھر بیچ میں بول اٹھیں۔ "پہلے طاہرہ پیچھے بچہ! کوئی نگوڑی سوتن جلاپا کا طعن تو نہ دے گی۔ اچھا بیٹی طاہرہ کے ابا بھی تماشہ دیکھنے گئے رات ہی کو گئے ہوں گے نوکر چاکر سوتے ہوں گے۔ چور گھس آئے ہوں گے۔ عورت ذات۔ بھرا گھر۔ نہ کوئی والی نہ وارث........"

لیکن رضیہ نے بات کاٹ کر کہا۔

"کیا منحوس باتیں منہ سے نکال رہی ہو۔ والی وارث کو خدا سلامت رکھے۔ میں گھر میں اکیلی تو نہیں تھی۔ ماما بھی تھی نوکر چاکر بھی تھے۔ چوکیدار بھی تھا۔ کوئی بارہ کا وقت ہو گا کہ اچانک میری آنکھ کھلی۔ دیکھا تو کمرہ دھوئیں سے بھرا ہوا تھا۔ میں نے جلدی

سے اُٹھ کر ایک کھڑکی کھولی۔ تو مکان کے شمالی حصہ کی طرف سے شعلے نکلتے نظر آئے میری چیخ پکار سے نوکر چاکر بھی جاگ اُٹھے۔ نجمہ میرے پاس سوتی تھی اور طاہرہ ایک چھوٹی پلنگڑی پر۔ میں نے نجمہ کو اٹھا کر گود میں لے لیا اور طاہرہ کو جھنجھوڑ کر جگایا وہ آنکھیں ملتے ہوئے بولی۔

"ابا! کیا ہے۔ سونے دو!"

میں نے اس کا بازو پکڑ کر اُسے اٹھایا اور کہا۔ طاہرہ! چلو نیچے آگ لگ گئی"

"ابا نہیں آئے!" اس نے آنکھیں ملتے ہوئے پوچھا۔

"نہیں!" میں نے اس کا ہاتھ پکڑ کر کہا۔ "آؤ میرے ساتھ!"

لیکن وہ ہاتھ چھڑا کر غسل خانے میں گھس گئی۔ دھوئیں سے میرا دم رک رہا تھا۔ نجمہ کندھے سے لگی۔ بلک رہی تھی۔ میں لپک کر غسل خانے کی طرف گئی۔ لیکن اللہ ہی جانے اس نے اندر سے کس طرح دروازہ بند کر لیا۔ طاہرہ! میں نے چلا کر کہا۔ دروازہ کھول دے۔ ورنہ جل جائیں گے ہم لیکن اس نے کچھ جواب نہ دیا۔ میں زور زور سے دروازے پر لاتیں مارنے لگی کہ نگوڑے پٹ ہی ٹوٹ جائیں۔ لیکن پٹ کہاں ٹوٹتے تھے میں

برابر چلا رہی تھی۔ لیکن طاہرہ اندر سے کچھ جواب نہ دیتی۔ پھر میں نے نوکروں کو پکارا۔ لیکن وہاں تو شور و غل سے کان پڑی آواز بھی نہ سنائی دیتی۔ میں کبھی دروازے کی طرف بھاگتی۔ کبھی غسل خانے کا دروازہ کھٹکھٹاتی۔ آوازیں دیتی۔ منتیں کرتی۔ لیکن سب بے سود اب آگ ساتھ کے کمرے تک آگئی تھی۔ گرمی اور دھوئیں سے میرے اوسان بھی خطا ہو رہے تھے۔ اتنے میں اس کے ابا کی آواز سنائی دی۔ میں نے کھڑکی میں سے سر نکال کر پکارا۔ اے جلدی آؤ اوپر۔ وہ بھاگتے بھاگتے اوپر آئے اور چلا کر بولے بھاگو نیچے۔ پھر۔ میری طاہرہ کہاں ہے۔ وہ غسل خانے میں ہے۔ میں نے گھبرائی ہوئی آواز سے کہا۔ اندر سے دروازہ بند کر رکھا ہے اس نے۔ وہ غسل خانے کی طرف لپکے میں بچّی کو لے کر نیچے بھاگ آئی۔ آگ بجھانے والا انجن آچکا تھا۔ آگ پر جلدی ہی قابو پا لیا گیا۔ میں نجمہ کو کندھے سے لگائے برآمدے میں کھڑی تھی کہ ماما آگئی۔ میں نے پوچھا۔ مل گئی طاہرہ؟ اس کے آنسو نکل آئے۔ میں کلیجہ مسوس کر رہ گئی۔ "اس کے ابا" میں نے بھرائی ہوئی آواز سے پوچھا "اللہ نے بچا لیا" ماما نے جواب دیا۔ "لیکن ابھی ہوش میں نہیں آئے"

ماما سے معلوم ہوا کہ وہ غسل خانے کا دروازہ توڑنے میں مشغول

تھے اور آگ اسی کمرے کے دروازوں تک پہنچ چکی تھی۔ تاہم انہوں نے غسل خانے کا دروازہ توڑ ہی ڈالا۔ لیکن طاہرہ دم گھٹ جانے سے مر چکی تھی۔ اس کے ابا اس صدمے سے وہیں بیہوش ہوکر گرے۔ خدا کو بچانا منظور تھا کہ آگ بجھانے والے وقت پر پہنچ گئے اور انہیں جلتے کمرے میں سے نکال لائے۔"

"باپ ہو تو ایسا ہی ہو" بڑی بی بولیں "واہ رے میرے مرد! تم تو اپنی نجمہ کو لے بھاگیں وہ اپنی طاہرہ کو کیسے چھوڑ سکتے تھے۔

"واہ بڑی بی" رضیہ نے کہا "خوب انصاف کی کہی تم نے"

"رضیہ!" بڑی بی بولیں "سچی بات تو میں خدا کے منہ پر بھی کہہ دوں"

"لیکن میں کرہی کیا سکتی تھی"؟ رضیہ نے پوچھا۔

جو تم نے اپنی نجمہ کے لئے کیا ہوتا" بڑی بی نے جواب دیا۔ جو طاہرہ کے ابا نے طاہرہ کے لئے کیا۔ اچھا تو وہ غریب تو جل مری۔ اس کے ابا بھی تو جیتے جی مر مٹے ہوں گے۔ اولاد کی محبت بری بلا ہوتی ہے"

"سچ ہے!" رضیہ بولی "واقعی اولاد کی محبت بری بلا ہوتی ہے۔

طاہرہ کے مرنے کا جو صدمہ انہیں ہوا۔ میں بیان نہیں کرسکتی بچوں کی طرح پھوٹ پھوٹ کر روتے تھے۔ لاش سے لپٹ لپٹ جاتے تھے۔ جنازہ اٹھنے نہیں دیتے تھے...... رضیہ کی آنکھوں سے آنسو گرنے لگے۔

"توبہ ہے!" بڑی بی نے ایک آہ بھر کر "خدا اولاد کا صدمہ تو دشمن کو بھی نہ دکھائے۔ جنازہ کیسے اٹھنے دیتے۔ وہ دیکھتے تھے کہ جگر کا ٹکڑا کوئی چھینے لیئے جاتا ہے۔ تمہیں بھی تو صدمہ ضرور ہوا ہوگا۔"

"یہ کچھ اللہ ہی جانتا ہے!" رضیہ نے دوپٹے سے آنسو پونچھتے ہوئے کہا۔ "آخر ان کے احباب نے انہیں سنبھالا اور جنازہ اٹھا کر لے گئے۔ چالیس روز تو صبح بھی اور شام بھی قبر پر جاتے رہے۔ لیکن اس تمام عرصے میں مجھ سے ایک لفظ بھی نہیں کہا۔ چہلم کے بعد وہ میرے پاس آبیٹھے۔ کچھ دیر تو خاموش ہی بیٹھے رہے۔ پھر مجھ سے کہنے لگے۔

"رضیہ! اگر طاہرہ کی ماں زندہ ہوتی تو جیتے جی تو بچی کو یوں چھوڑ کر نہ جاتی۔ خیر! جو ہوا سو ہوا" یہ کہہ کر جیب سے انہوں نے ایک کاغذ نکالا اور میری طرف پھینک کر کہا۔

"دو سو روپے ماہوار تمہیں مل جایا کریں گے۔" بس اتنا کہہ کر باہر چلے گئے۔ آٹھ سات روز جب وہ گھر نہ آئے تو میں بھی میکے چلی آئی۔ اس واقعہ کو سال ہونے کو ہے۔ دو سو روپے ماہوار برابر بنک والے مجھے بھیج دیتے ہیں۔ لو! یہ ہے کل قصہ! اب تو شن لیا تم نے"

"اچھا بیٹی!" بڑی بی ایک آہ بھر کر بولیں۔ "صبر کر۔ کبھی راہ پر آ ہی جائیں گے۔ اب بچی کو بلوا لیتے ہیں کبھی تمہیں بھی بلوا بھیجیں گے۔"

رضیہ بولی۔

"ہوتا وہی ہے جو خدا کو منظور ہے۔ لیکن اس میں کچھ شک نہیں۔ کہ جتنی نجمہ مجھے پیاری ہے اس کا اور کوئی اندازہ نہیں لگا سکتا۔ اس لئے اب جو میں کبھی سوچتی ہوں تو یہ ماننا ہی پڑتا ہے کہ ہاں! وہ بھی سچے تھے۔"

رضیہ

رضیہ ایک شریف گھرانے کی تعلیم یافتہ لڑکی تھی۔ حُسنِ سیرت کے ساتھ قدرت سے حسن وجمال بھی دوسروں سے کچھ سوا ہی عطا ہوا تھا۔ بچپن جیسے کہ امیروں کے یہاں ہوا ہی کرتا ہے بڑے ناز ونعمت سے گذارا۔ سیانی ہوئی تو سکول جانے لگی۔ اور گھر پر بھی ایک اُستانی تعلیم اور تربیت کے لئے مقرر کردی گئی۔ گو رضیہ کی تعلیم اور تربیت تو مغربی طور طریق سے ہو رہی تھی۔ لیکن گھر میں چونکہ اسلام کا رنگ بھی تھا۔ اس لئے اسلامی تعلیم سے بھی کوری نہ رہی۔ نہ صرف اسلامی تعلیم بلکہ اسلامی معاشرت اور

تمدن سے مانوس بھی ہوتی رہی۔ اسی لئے رضیہ کی ہر
بات میں اسلام کی جھلک بھی نمایاں تھی۔ عام روش
کے مطابق رضیہ کو نماز روزے سے کچھ دل بستگی نہ
ہونی چاہیئے تھی۔ لیکن یہ اللہ کی دین تھی کہ اس شریف
زادی کے دل میں خدا کا خوف اور ہادئ اسلام صلعم کا
احترام بھی تھا۔ صبح نماز بھی پڑھتی اور قرآن حکیم کی تلاوت
بھی کرتی۔ طبیعت میں انکسار بھی تھا اور حلم بھی اور بنی نوع
انسان کا دل میں درد بھی تھا۔ اگر کسی کو بے تاب دیکھتی تو
خود بھی بے تاب ہو جاتی۔ سائل اور ضرور تمند کی حاجت اور
ضرورت کا بہت زیادہ خیال رکھتی۔ وہ لوگ جو دنیوی نقطۂ
نظر سے رضیہ سے رتبہ میں کم تھے۔ ان سے اگر ملنے کا کبھی
اتفاق ہوتا تو کچھ اس اخلاص اور محبت سے ملتی کہ ملنے والا
دل پر ایک گہرا نقش لے کر اٹھتا۔

اچھی تعلیم یافتہ ہونے کے باوجود رضیہ کو امور خانہ
داری کا بھی خاص شوق تھا۔ بے کار بیٹھنا تو وہ جانتی ہی
نہ تھی۔ مطالعہ سے فارغ ہوئی اور کچھ سینا پرونا لے
بیٹھی۔ کبھی دل چاہا تو ماما کا کھانا پکانے میں ہاتھ بٹانے

بیٹھ جاتی۔ ایسی ہوشمند لڑکی پر ماں باپ جتنا بھی ناز کرتے کم تھا۔

چونکہ گھرانا وسیع تھا اس لئے ملنے جلنے والیاں بھی اکثر آتی جاتی رہتیں اور رضیہ بھی کبھی کبھی دوسروں کے گھر چلی جاتی۔ لیکن کُنبے میں جہاں کہیں بھی جاتی بہت سادہ لباس پہن کر جاتی۔ ظاہری بناؤ سنگار کا بھی رضیہ کو کچھ ایسا شوق نہ تھا۔ گو لباس سادہ ہی ہوتا لیکن اس سادگی میں بھی ایک نفاست ہوتی۔ جو دیکھنے والے کو خوشنما نظر آتی۔ حالانکہ اس کی اکثر ملنے والیاں سرخی اور غازے کی چہرے پر پوت کئے بغیر گھر سے قدم باہر نکالنا بھی حرام سمجھتیں۔ خیر یہ سرخی پوڈر تو کچھ ایسی بُری چیز نہیں۔ اس کا تو اب گھر گھر رواج ہو رہا ہے۔ لیکن ستم یہ ہے کہ ہماری آج کل کی مغرب زدہ عورتیں کچھ حد سے زیادہ تجاوز کرنے لگی ہیں۔ اور ان کی شکل صورت دیکھ کر یہ ماننا پڑتا ہے کہ ہاں

'جو خال حد سے گزرا بیشک مِٹا ہوا!'

ان عورتوں کا لباس بھی کچھ ایسا بیہودہ ہوتا ہے کہ اس میں

عریانی کی جھلک بھی پائی جاتی ہے۔ لیکن تعجب ہے کہ یہ عورتیں ان باتوں کو برداشت کیسے کر لیتی ہیں ایسی عورتیں تو رضیہ کو ایک آنکھ نہ بھاتیں، وہ دل میں اکثر سوچا کرتی کہ آخر یہ تماشا کیا ہے کہ ہندوستانی عورتوں کو اپنے یہاں کی معاشرت اور تمدن سے بھی عار آنے لگی ہے۔

اسی طرح رضیہ کی ملنے جلنے والیوں کو بھی رضیہ کا اسلامی شعار پر کاربند نظر آتا کچھ ایسا پسند نہ تھا۔ جہاں کہیں دو چار مل کر بیٹھتیں تو رضیہ غریب کا ہی ذکر لے بیٹھتیں۔ ایک کہتی۔

"بوا! تم رضیہ کی بات تو رہنے ہی دو۔ اس شکل و صورت پر پلّے بھی کوئی مولوی ہی پڑے گا۔"

"ہاں بوا! دوسری کہتی "کوئی تعلیم یافتہ لڑکا کاہے کو ایسی جورو پسند کرنے لگا۔"

ایک اور یوں ارشاد فرماتیں۔

"یہ پانچوں وقت کی اٹھک بیٹھک بھی بھلا کہاں کا اسلام ہے۔ دو ایک بار اٹھو بیٹھو تو سلوٹ پڑ کر کپڑوں کا ستیاناس ہو جاتا ہے۔"

اور پاس سے ایک اور کی آواز آئی۔

"بہن! نمازوں پر بھی اسی وقت زور ہوتا ہے۔ جب ۱۰
کوئی ملنے کو آئی ہو۔"

اور کسی اور طرف سے سنائی دیتا۔

"میرا تو خیال نہیں کہ کوئی اچھا بر ملے"

ان عورتوں میں اکثر اسی قسم کے تذکرے ہوا کرتے یہ باتیں رضیہ تک بھی پہنچتیں۔ لیکن وہ مسکرا کر خاموش ہو رہتی۔

*

کچھ دنوں سے پڑوس میں ایک وکیل صاحب بھی آ بسے تھے۔ بڑے ٹھاٹھ سے رہتے تھے۔ تھے تو مسلمان ہی لیکن شکل وصورت سے کرسٹان ہی معلوم ہوتے اور غالباً چاہتے بھی یہی تھے کہ لوگ انہیں "صاحب" ہی سمجھا کریں۔ ان کی بیگم صاحبہ بھی مغربی معاشرت اور مغربی طریق زندگی بہت پسند فرماتی تھیں۔ آزاد خیال لوگ تھے۔ پردہ وغیرہ ان کے یہاں "جاہل مسلمانوں" کی "بیہودہ رسم" کہلاتا تھا۔ ایک بیٹی بھی تھی وہ والدین سے بھی زیادہ اس رنگ میں رنگی ہوئی تھی۔ نماز روزے کا گھر میں بالکل دستور نہ تھا۔ اور اگر شامت کا مارا کوئی نوکر نمازی ہوتا تو اس پر بری طرح لتاڑ پڑتی۔

کسی سائل یا محتاج کو کچھ دینا دلانا ان کے نقطۂ نظر سے ایک بہت بُری بات تھی۔ کیونکہ اس سے گداگری کی تحریک ہوتی تھی۔ رضیہ کے ہاں بھی وکیل صاحب کی بیگم صاحبہ کا آنا جانا تھا۔ بظاہر بڑی خلیق اور ملنسار عورت تھی۔ جب آتی گھنٹہ دو گھنٹے بیٹھتی پھر یہ کہہ کر

"لیجئے! اب اجازت دیجئے۔ صاحب کے آنے کا وقت ہے" جانے کی اجازت مانگتی۔

ایک روز جو یہ بیگم رضیہ کے یہاں آئی تو رضیہ کچھ سینے پرونے کا کام کر رہی تھی۔ آتے ہی پوچھا:

"ہیلو ڈیر! یہ کیا کر رہی ہو"

رضیہ نے اٹھ کر پہلے سلام و علیکم کہا۔ پھر مزاج پرسی کی۔ اس پر وکیل صاحب کی بیگم ہنس کر بولیں۔

"اوہو۔ مس رضیہ! اتنی تعلیم یافتہ ہو کر بھی تم وہی دقیانوسی رسم و رواج پر چلی جا رہی ہو"

"کیسے دقیانوسی رسم و رواج؟" رضیہ نے مسکرا کر پوچھا۔

"یہی!" وکیل کی بیگم نے جواب دیا "آتے ہی اسلام وعلیکم

داغ دیا۔ یہ رسم تو اب اٹھتی جا رہی ہے۔

لاحول ولا قوۃ! رضیہ نے وکیل کی بیگم کی طرف دیکھ کر کہا "یہ آپ کیا فرما رہی ہیں کسی کو سلام کرنا دقیانوسی کیسے ہوگیا؟"

وکیل کی بیگم: "لیکن سوسائٹی میں تو اس قسم کی باتیں اب متروک ہو چکی ہیں"

رضیہ: "کون سی سوسائٹی! میرے خیال میں تو سب سے زیادہ مہذب اور قابلِ تقلید سوسائٹی تو اسلام کی ہے"

وکیل کی بیگم: "(مسکرا کر) اجی رہنے بھی دو یہ اسلام! پرانے رسم و رواج کے جکڑ بندوں سے کوئی نکلنے ہی نہیں پاتا یہی باتیں تو مسلمانوں کے زوال کا باعث بن رہی ہیں"

رضیہ (مسکرا کر) "لیکن مسلمان تو آپ بھی ہیں۔ یا انکار ہے اس سے"

وکیل کی بیگم: "نہیں! مجھے تو انکار نہیں۔ نام ہی کافی ہے، یا اللہ کو ایک ماننا"

رضیہ نے تعجب سے وکیل کی بیگم کی طرف دیکھا اور کہا۔

"لیکن یہ تو اسلام نہیں"

"تو کیا؟" وکیل کی بیگم نے جواب دیا "آپ کا اسلام یہ ہے

کہ چوبیس گھنٹے کوٹھری میں گھسی رہو۔ پانچ پانچ منٹ بعد ماتھا رگڑو۔ دن بھر چولھا جھونکو۔ دنیا اور دنیا کے رنگ ڈھنگ سے دُور کا بھی واسطہ نہ رکھو۔ جہاں جاؤ! جھٹ مصلے بچھاؤ اور تسبیح لے کر بیٹھ جاؤ۔ کیوں مس رضیہ! یہی کہتا ہے نا آپ کا اسلام؟"

"ہرگز نہیں" رضیہ نے جواب دیا۔ "آپ نے یہ باتیں کہاں سے سن لیں۔ اسلام نے تو یہ کبھی حکم نہیں دیا کہ عورت دن بھر چولھا جھونکا کرے۔ اسلام کا یہ منشا بھی ہرگز نہیں کہ آپ زمانے اور زمانے کے رنگ ڈھنگ سے کورے رہیں۔ اسلام کی یہ تعلیم بھی نہیں کہ جہاں جاؤ مصلے اور تسبیح ساتھ لئے پھرو۔ اسلام ہی تو ایک ایسا مذہب ہے جس نے عورت کو آزادی عطا کی ہے۔ اسلام نے جو احسان عورت پر کئے ہیں۔ دنیا کے کسی مذہب میں بھی آپ کو ان کی مثال نہیں ملے گی۔ اسلام کی تعلیم تو یہ ہے کہ جہاں جانا ہو نقاب پہن کر جاؤ اگر واقعات اجازت دیں تو مردوں کے دوش بدوش قوم اور مذہب کی خدمت بھی کرو۔ باقی رہی نماز تو جناب! یہی ایک چیز تو مسلمان ہونے اور کہلانے کی نشانی ہے۔ اسی چیز سے تو مسلمان کی شان

نظر آتی ہے یہی تو وہ چیز ہے جو بندے کو خدا سے ملا دیتی ہے"۔
وکیل کی بیگم ہنس کر بولی۔
"یہ تو بالکل ٹھیک ہے۔ لیکن مس رضیہ تم نے کبھی یہ بھی سوچا کہ بعض ضروری کاموں میں نماز کتنی حارج ہوتی ہے صبح سونے کا وقت ہوتا ہے اور آپ کے مُلا نے پو پھٹتے ہی اللہ اکبر کا شور وغوغا بلند کرنے لگتے ہیں۔ خواہ گھر میں کوئی ملنے ہی آیا ہو لیکن آپ کا حکم ہے کہ سب سے الگ ہو کر نماز میں مشغول ہو جاؤ۔ خیال تو کیجئے۔ کتنی بیہودگی اور بد تہذیبی ہے"۔
"گویا!" رضیہ نے جواب دیا "آپ احکام الٰہی کا مذاق اڑاتی ہیں۔ اللہ توبہ! آپ نعرۂ توحید کو شور وغوغا فرماتی ہیں۔ اور اس پر آپ کو یہ دعوے بھی ہے کہ آپ اللہ کو ایک مانتی ہیں"۔

*

ان دونوں میں یہی باتیں ہو رہی تھیں کہ رضیہ کی ماں بھی آگئی اور اسلام علیکم کہہ کر پاس بیٹھ گئی پھر کہنے لگی۔
"فرمائیے؟ وکیل صاحب تو اچھے ہیں"
"شکریہ!" وکیل کی بیگم نے مسکرا کر کہا "عنایت ہے آپ کی"۔
رضیہ کی ماں "کبھی جمیلہ بی بی کو بھی تو ساتھ لایا کیجئے۔

وکیل کی بیگم: "جمیلہ آج کل امتحان کی تیاری کر رہی ہے امتحان سے فارغ ہوئے تو خود ہی چلی آئے گی۔"

رضیہ کی ماں: "کون سے امتحان کی تیاری ہو رہی ہے؟"

وکیل کی بیگم: "ابھی تو انٹرنس کا امتحان دے گی اگر واقعات نے اجازت دی تو بی، اے کی ڈگری لے گی۔"

رضیہ کی ماں: "اور شادی کب ہوگی۔ بچی تو اب جوان ہوگئی"

وکیل کی بیگم۔ (ہنس کر) "یہ تو جمیلہ ہی سے پوچھنے میں کیا جانوں بھلا"

رضیہ کی ماں۔ (حیران ہو کر) "جمیلہ سے پوچھوں۔ کنواری لڑکی سے۔ توبہ ہے!"

وکیل کی بیگم۔ (ہنس کر) کچھ گناہ کی بات کہہ دی میں نے کم از کم لڑکیوں کو آپ اتنی اجازت تو دیں کہ اپنے شوہر خود پسند کریں۔ ماں باپ کا تو صرف اتنا ہی فرض ہے کہ کسی شریف لڑکے کو گھر بلا کر لڑکی سے اس کا تعارف کروا دیں اور اپنی ایک دوسرے کی طبیعت سمجھنے اور عادات و اطوار سے واقف ہونے کا موقع دیں۔"

رضیہ کی ماں: "اور اگر دونوں کی طبیعت نہ ملے تو؟"

وکیل کی بیگم۔ تو پھر اور بر تلاش کریں۔ یہ کوئی بہری بات تو ہے نہیں۔

رضیہ کی ماں۔ معاف کیجئے! اسلام اتنی اجازت تو ضرور دیتا ہے کہ لڑکی اور لڑکے کی مرضی دریافت کر لی جائے۔ اور وہ ایک دوسرے کو دیکھ بھی لیں۔ لیکن جو کچھ آپ فرما رہی ہیں یہ تو اسلام کی تعلیم مسلمانوں کی تہذیب اور ان کے تمدن کے سراسر خلاف ہے۔ اور ملک کا رسم و رواج بھی ایسا نہیں۔"

وکیل کی بیگم۔ یہ تو اپنا اپنا خیال ہے۔ لیکن ہم لوگ تو اس میں کوئی قباحت نہیں دیکھتے۔ آپ نے کبھی سوچا یہ جو آئے دن جھگڑے بکھیڑے سننے میں آتے ہیں اس کی وجہ کیا ہوتی ہے۔ یہی نا کہ لڑکی کو خاوند پسند نہیں آتا اور خاوند کو لڑکی پسند نہیں اور مصیبت پڑتی ہے ماں باپ پر۔ تو پہلے ہی اس کا تدارک کیوں نہ کر لیا جائے۔ لڑکا لڑکی سے بات چیت کرے گا اسے کھا تو نہیں جائے گا۔ اگر اس تعلیم اور ترقی کے زمانے میں بھی ہم لوگ اتنی فراخ دلی نہ دکھلائیں گے تو دنیا تو ہمیں پھسڈی اور غیر مہذب ہی تو سمجھے گی۔ اور جو لڑکی لڑکے پر ظلم ہو گا وہ علیحدہ۔"

رضیہ کی ماں۔ معاف کیجئے گا! آپ کے خیالات معلوم کر کے

تو مجھے حیرت سی ہو رہی ہے۔ میں حیران ہوں کہ ہماری اسلامی شرافت غیرت اور حمیت کو کیا ہوا۔ آپ کا ضمیر کیوں خاموش ہو گیا۔ اسلام کا رنگ کیوں آپ کو پسند نہیں۔؟

وکیل کی بیگم: "جی ہاں! ہمارا ضمیر تو محض اس لئے خاموش ہے کہ ہم پرانے رسم ورواج کے پابند نہیں رہے۔ رہی اسلامی شرافت اور حمیت تو سچی بات تو یہ ہے کہ میں نے تو جب سے ہوش سنبھالا ہے۔ کہیں دیکھی نہیں۔ ہاں سنتی ضرور ہوں۔ شاید آپ نے یہ نہیں سنا کہ ع

"چلو تم ادھر کو ہوا ہو جدھر کی"

رضیہ کی ماں: "خواہ یہ ہوا اڑا کر اندھے کنوئیں میں کیوں نہ جا گرائے۔ سبحان اللہ! کتنے پاکیزہ خیالات ہیں آپ کے کہ بیٹی کو نامحرموں سے ملانے میں آپ کچھ عار محسوس ہی نہیں کرتیں یہ تو مغرب کی گندی تقلید ہی کا سب اثر ہے کہ ہم لوگ مذہب سے اتنے دور ہوتے چلے جا رہے ہیں۔ ہم اگر قرآن حکیم اور رسول کریم صلعم کی تعلیم پر کاربند رہتے تو زمانۂ سلف کے مسلمانوں کی طرح ہم بھی دنیا میں سرفراز ہو کر رہتے"

وکیل کی بیگم: "تو گویا قرآن کی تعلیم یہ ہے کہ لڑکی اپنے ہونے

والے شوہر سے کبھی بات چیت نہ کرے اور جو کبھی مرد کا سامنا
ہو بھی تو ڈیڑھ ہاتھ کا گھونگھٹ نکال کر آئے یا ماں باپ جس اندھے
کوئیں میں دھکیل دیں، دھکیل دیں، لڑکی نہ ہوئی مصیبت ہوگئی"
رضیہ کی ماں " اندھے کوئیں میں کوئی کیوں گرائے۔ بلکہ خوب
دیکھ بھال کر بر تلاش کریں۔ خود اس کے عادات واطوار سے
واقفیت حاصل کریں۔ اسی طرح لڑکے والے بھی اپنی مستورات
کے ذریعہ لڑکی کو اچھی طرح دیکھ بھال لیں جب دونوں طرف سے
اطمینان ہو جائے تو پھر دونوں کی مرضی بھی معلوم کرلی جائے۔
افسوس تو یہ ہے کہ نماز، روزہ اور اسلام کے دیگر ارکان کی طرف
تو کسی کی توجہ ہی نہیں۔ لیکن جس اخبار یا رسالہ کو اٹھا کر دیکھئے
بر کی تلاش پر ایڑی چوٹی کا زور لگا کر مضامین لکھے جا رہے ہیں
حالانکہ تقلید کے لئے حضور سرورِ عالم صلعم کی چاہتی صاحبزادی
خاتون جنت بی بی فاطمہ کی شادی کا نمونہ موجود ہے۔
میری رضیہ کے پاس بھی کئی اخبار آتے ہیں سچ نانئے!
مجھے تو لڑکیوں کے مضامین پڑھ کر شرم اور گھن آنے لگتی ہے
جسے دیکھو حُسن والفت کی داستان پر زورِ قلم دکھا رہی ہے کوئی
پردے کے خلاف زہر اگل رہی ہے۔ کہیں بے "گوشت وال پلاؤ"

پکانے پر بحث چھڑ رہی ہے۔ لیکن یہ کہ کوئی اسلام کی خوبیوں پر بھی کچھ لکھے۔ دختران اسلام کی زندگی کے واقعات قلمبند کرے۔ اسلام کی عظمت پر زورِ قلم دکھائے ایسی توفیق کسی کو نہیں۔ سچ تو یہ ہے کہ ہم لوگ واقعی اب صرف نام کے ہی مسلمان ہیں۔ ہماری ہر بات میں ظاہر داری۔ تصنع۔ بناوٹ پائی جاتی ہے۔ نہ ہمارے دل میں اسلام کی عظمت نہ اسلام کا درد نہ ہماری معاشرت اسلامی نہ ہمارے رسم ورواج اسلامی اللہ ہی ہے جو ہم پر رحم کرے۔"

رضیہ کی ماں جب کہہ چکی تو وکیل کی بیگم نے کھسیانی ہنسی ہنس کر کہا

بعض باتیں تو آپ نے واقعی بڑی تکی کہیں۔ لیکن ذرا یہ بھی تو سوچئے کہ اگر ہم لوگ آج مذہب سے اتنے بیگانہ ہو رہے ہیں تو قصور کس کا ہے۔ آپ بڑی بوڑھیوں کا یا ہمارا۔ اگر آپ ہمیں ہوش سنبھالنے کے ساتھ کسی مدرسے میں بھیجنے کی بجائے گھر پر اسلام کی تعلیم دلوا دیتے تو شاید ہم پر آج اتنی لتاڑ بھی نہ پڑتی۔"

رضیہ کی ماں۔ میں مدرسہ کی تعلیم کے خلاف نہیں۔ تعلیم

ہر لڑکی کے لئے بہت ضروری چیز ہے۔ اور قوم کی ترقی اسی میں ہے کہ لڑکیاں تعلیم یافتہ ہوں۔ اگر لڑکیاں تعلیم یافتہ ہوں گی تو اچھی مائیں بنیں گی اور خانہ داری کو اچھی طرح سمجھ سکیں گی۔ لیکن اس کے ساتھ یہ بھی ضرور ہے کہ بچیوں کو اسلامی تعلیم بھی ضرور ملنی چاہئے۔ نماز روزہ اور قرآن کی طرف سے کبھی غافل نہیں ہونے دینا چاہئے۔ اگر بچے کے دل میں اسلام کی عظمت ایک بار پیدا ہو جائے تو بڑے ہونے پر بھی وہ مذہب سے اتنا بیگانہ نہیں رہے گا۔"

رضیہ کی ماں نے وکیل کی بیگم کو ایسا آڑے ہاتھوں لیا کہ اب وہ کھسکنے کی راہ دیکھنے لگی اور آخر یہ کہکر کہ لیجئے اب رخصت دیجئے۔ صاحب آنے والے ہوں گے وقت سے کچھ پہلے ہی چلی گئی

رمضان کا مہینہ تھا۔ رضیہ کی شادی کی تیاریاں ہو رہی تھیں۔ عید کے چاند کی کوئی تاریخ مقرر ہو چکی تھی۔ اکرام جس سے رضیہ منسوب تھی ایک شریف خاندان کا چشم و چراغ تھا ایف، اے پاس کر چکا تھا۔ باپ بہت امیر آدمی تھا۔ رشتہ

ہونے سے پہلے رضیہ کی ماں نے اکرام کے حالات سے بیٹی کو آگاہ کر دیا تھا اور اس کی سہیلیوں کے ذریعے اس کی رضامندی بھی حاصل کی جا چکی تھی۔ شادی بہت دھوم دھام سے ہوئی۔ ماں باپ نے بھی اتنا جہیز دیا کہ مہمان شوق سے دیکھتے تھے۔ اور سسرال والے بھی اتنا گہنا پاتا اور ایسے بھاری جوڑے لائے کہ دیکھنے والوں کو رضیہ کی خوش قسمتی پر رشک آتا تھا جب رضیہ پینس میں سوار ہوئی اور کہاروں نے پینس اٹھائی تو سسرال والوں نے مٹھیاں بھر بھر کر روپے پینس پر نچھاور کئے۔

جب رضیہ سسرال پہنچی تو پینس سے اترتے ہی دو بکرے قربانی کئے گئے۔ اور دولہن کو ایک بہت آراستہ کمرے میں لاکر بٹھایا گیا۔ دیکھنے والیاں ایک دوسری پر گری پڑتی تھیں رضیہ گھر سے ظہر کی نماز پڑھ کر پینس میں سوار ہوئی تھی۔ آج مدت کے بعد پہلا موقع تھا کہ عصر کی نماز قضا ہو گئی۔ جب شام ہوئی تو رضیہ نے اپنی نوکرانی کو جو ساتھ آئی تھی اشارہ کیا وہ کسی بہانے اسے کوٹھے پر لے آئی رضیہ کی نند بھی ساتھ آئی۔ یہاں رضیہ نے پانی منگوا کر وضو کیا۔ اور دونوں نمازیں

اداکیں۔ بس اب کیا تھا عورتوں کو انگشت نمائی کا موقع مل گیا۔ ایک بولی۔

لو دیکھ لیا نا! مدرسہ کی تعلیم کا نتیجہ۔ نہ شرم نہ حجاب"

ایک اور بولی

"حد ہو گئی! نئی دلہن تو کئی کئی روز کسی سے بات ہی نہیں کرتی اور انہوں نے آتے ہی مصلےٰ بھی بچھا لیا"

ایک اور کہنے لگی۔

"میری بہو جب سسرال گئی تھی تو حرام ہو جو آٹھ پہر ایک دانہ بھی منہ میں ڈالا ہو"

ایک اور نے کہا۔

"اور یہ بھی دیکھا کہ سب کے سامنے کس طرح ماما کے ساتھ کوٹھے پر چلی گئی"

ایک اور نے کہا۔

"ابھی تو پہلا ہی دن ہے۔ کل دیکھو بہو رانی گھر کا انتظام بھی سنبھال لے لگیں۔

پہلی نے ہنس کر کہا۔

"تم دیکھنا دو روز میں ہی میاں سے کھلم کھلا باتیں بھی ہونے

لگیں گی۔"
الغرض جتنے منہ اتنی باتیں۔

رضیہ کا بیاہ ہوئے چھ مہینے گزر چکے تھے۔ رضیہ چونکہ نماز کی پابند تھی اس لئے اس کی دیکھا دیکھی اس کی ساس بھی ایک آدھ نماز پڑھ لیتی۔ رضیہ کی نند رقیہ کو اپنی بھاوج سے بہت محبت ہو گئی تھی وہ اسے آپا کہتی تھی۔

ایک روز رقیہ کی کسی سہیلی نے اسے کوئی تحفہ بھیجا۔ رقیہ تحفے کی رسید اور شکریہ کا خط لکھنے بیٹھ گئی جب لکھ چکی تو رضیہ کو دکھایا کہ لو آپا! دیکھ لو کوئی غلطی تو نہیں"

رضیہ نے خط دیکھ کر کہا

"شاباش! بہت اچھا لکھا ہے۔ لیکن خط لکھنے کی کیا ضرورت تھی۔"

آپا! رقیہ نے ہنس کر کہا "جب کوئی تحفہ دے تو اس کا شکریہ بھی تو ادا کرنا چاہیئے"

"بے شک!" رضیہ نے جواب دیا "شکریہ تو ضرور ادا کرنا چاہیئے"

رقیہ "تو اسی غرض سے میں نے بھی یہ خط لکھا ہے"

رضیہ "لیکن تم اس خدا کا تو کبھی شکریہ ادا نہیں کرتیں جو تمہیں ہر روز اتنی نعمتیں دے رہا ہے"۔

"آپا!" رقیہ نے ہنس کر کہا "انسان خدا کی کون کونسی نعمت کا شکر کرے بھلا۔ وہ دینے والا ہم لینے والے"

"سبھی نعمتوں کا" رضیہ نے جواب دیا "ایک ایک نعمت کا گن گن کر"!

"وہ کیسے؟" رقیہ نے پوچھا۔

"اللہ کے حضور میں پانچوں وقت حاضر ہونے سے۔ نماز پڑھنے سے" رضیہ نے جواب دیا اس کے بندوں پر رحم کرنے سے۔ حاجتمند کی حاجت پوری کرنے سے"

رقیہ بولی

"لیکن نماز تو حاجتمند ہی پڑھا کرتے ہیں۔ یہاں تو سب کچھ موجود ہے۔ بی اماں کے ساتھ میں اکثر کئی ایک گھرانوں میں گئی ہوں مگر نماز پڑھتے تو کسی کو نہیں دیکھا ہاں! آپ کی دیکھا دیکھی ہمارے یہاں بھی اب نماز پڑھی جانے لگی ہے۔

رضیہ نے جواب دیا۔

یہ تو اچھی رہی کہ نماز صرف حاجتمند ہی پڑھا کرتے ہیں۔ رقیہ تم بالکل ہی نادان ہو۔ پگلی! نماز تو سب پر فرض ہے۔ کوئی غنی ہو یا محتاج۔ اللہ کے حضور میں سب یکساں ہیں۔ رقیہ نماز تو بڑا سہل کام ہے۔ ایک بار عادت پڑ جائے تو پھر کبھی مشکل معلوم نہیں ہوتی۔"

رقیہ "آپا! بھائی اکرام بھی نہیں پڑھتے"

رضیہ (ہنس کر) "ان کی بات رہنے دو تم۔ وہ تو صاحب بہادر ہیں"

رضیہ کا شوہر اکرام مغربی بودوباش کا دل دادہ تھا جب دیکھو کوٹ پتلون پہنے سر پر ہیٹ رکھے منہ میں سگرٹ دبائے چلا آرہا ہے۔ صبح نو سے پیشتر اٹھنا اس کے مذہب میں حرام تھا۔ جب آنکھ کھلتی تو تکیے کے نیچے سے سگرٹ نکال کر دھوئیں کے بادل اڑانے لگتا۔ منہ ہاتھ دھوئے بغیر صبح کا ناشتہ کرلیتا پھر ڈاڑھی مونچھ مونڈنے میں ایک گھنٹہ صرف ہو جاتا۔ ادھر کھانا کھایا ادھر ریڈیو گراموفون کا شوق ہونے لگا۔ پھر دو چار دوست آگئے اور شام تک گپ شپ ہوتی رہی۔ دل چاہا تو

سینما کو چل دیئے۔ یہ تھا اکرام کا دستورِ عمل۔ اور وہ اس میں کبھی ناغہ نہیں ہونے دیتا تھا۔ رضیہ کو اس کا نماز نہ پڑھنا، مونچھیں مونڈنا اور سگرٹ پینا سخت ناپسند تھا۔ اس روز جو وہ رقیہ سے باتیں کر رہی تھی تو اچانک اکرام بھی کہیں سے آنکلا۔ اور ہنس کر بولا۔

"ہاں جناب! ہم تو صاحب بہادر ہیں۔ لیکن آپ تو مسلمان ہیں نا۔"

رضیہ بولی۔

لو رقیہ! گویا ہم انہی کا ذکر کر رہے تھے۔ اسے کہتے ہیں چور کی ڈاڑھی میں تنکا۔"

"رقیہ"! اکرام نے بہن سے کہا۔ "سچ کہنا تمہاری آپا ہمیں ابھی ابھی کرسٹان کہہ رہی تھی نا۔"

رقیہ ہنسنے لگی۔ رضیہ بولی۔

"چلئے یوں ہی سہی! لیکن میں کچھ جھوٹ تو نہیں کہہ رہی تھی تعجب تو یہ ہے کہ آپ گرجا کیوں نہیں جاتے۔"

رقیہ ہنستی ہوئی چلی گئی۔ اکرام نے بیوی کے پاس بیٹھ کر سگرٹ جلایا اور کمرے کی فضا اس کی بدبو سے مکدّر کرنے لگا

رضیہ بولی۔

"دور بھی کرو اسے۔ اس کی بو سے تو میرا دماغ پھٹا جاتا ہے"

اکرام "اوہو! تمہیں اس سے بدبو آتی ہے۔ رضیہ! یہ تو بڑے مزے کی چیز ہے۔

"ہوا کرے!" رضیہ نے جواب دیا "لیکن اس سے کچھ حاصل بھی؟"

"اچھا جناب!" اکرام بولا "آپ ناراض نہ ہوں ہم آپ کے کمرے میں سگرٹ نہیں پیا کریں گے"

"ایک بات کہوں" رضیہ نے مسکرا کر کہا "بشرطیکہ آپ برا نہ مانیں"

"ایک کیا!" اکرام نے جواب دیا "آپ کی ہزار سن کر بھی برا نہ مانوں؟"

"شکریہ!" رضیہ نے ذرا سر جھکا کر کہا "میرا دل چاہتا ہے کہ میں بھی سر کے بال کٹوا دوں"

اکرام "یہ کیوں۔ یہ کیا سوجھی آپ کو۔ نا صاحب! یہ فرنگنوں کے ڈھنگ ہمیں تو مطلق پسند نہیں۔ ذرا دیکھو تو ہاتھ سے بیوی کے بالوں کو چھو کر۔ کیا سنبل ایسے باریک اور کونلوں

کی طرح سیاہ اور ریشم ایسے نرم بال ہیں۔ پھر یہ مانگ خدا کی قسم! کالے پہاڑ سے جوئے شیر بہتی نظر آرہی ہے۔ خدا کے لئے کہیں ایسا ظلم مت کرنا ان خوبصورت بالوں پر"

رضیہ:" اگر آپ مجھے فرنگنوں کی تقلید سے روکتے ہیں تو آپ کیوں فرنگی بنے ہوئے ہیں۔ ڈاڑھی تو خیر شوق سے منڈائیے لیکن ان غریب مونچھوں نے کیا قصور کیا جو صبح صبح ان پر بھی استرا چلنے لگتا ہے۔ گویا آپ کو یہ افسوس ہے کہ قدرت نے آپ کو مرد کیوں بنایا۔ ٹھیک ہے نا"

اکرام:" اجی جناب! یہ تو آج کل فیشن ہے"

رضیہ:" لیکن اسلامی تہذیب تو اس کی اجازت نہیں دیتی۔ میں حیران ہوں کہ آپ مسلمان ہو کر مغربیت پر کیوں لٹو ہو رہے ہیں۔ ذرا ایمان سے تو کہئے! ہے بھی کوئی مسلمانوں ایسی بات آپ میں اعتبار نہ ہو تو شکل و صورت دیکھ لیجئے۔ لاؤں آئینہ؟"

اکرام۔ چلو جی! ہم کافر سہی۔ تم تو مسلمان ہو۔ گھر میں ایک مسلمان ہی کافی ہے" چلو چھوڑو ان فضول باتوں کو۔ وہ ذرا نیا ریکارڈ تو سناؤ۔ ساون کی آئی بہار!"

رضیہ: "پہلے میری بات کا جواب دیجئے۔ پھر ریکارڈ بھی سن لیجئے گا۔ ریکارڈ کہیں بھاگا تو نہیں جاتا۔

اکرام: "کیا؟"

رضیہ: "آپ موچھیں کیوں مونڈتے ہیں؟"

اکرام۔ (مسکرا کر) سوال نمبر ایک۔ آگے فرمائیے۔

رضیہ: "آپ مرد ہو کر عورت بننا کیوں پسند کرتے ہیں۔

اکرام۔ سوال نمبر دو۔ آگے چلئے۔ سب سوالوں کا اکٹھا جواب دیں گے۔"

رضیہ: "نہیں! پہلے ان باتوں کو جواب دیجئے۔"

اکرام (ہنس کر) اجی جناب! آج کل موچھیں منڈوانا چونکہ فیشن ہے اس لئے ہم بھی مونڈتے ہیں۔ اس میں مرد اور عورت کی صورت کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ (بیوی کی ٹھوڑی ہلا کر) کیوں ماسٹر صاحب! ہو گئی تسلی آپ کی۔ فرمائیے ہم فیل ہوئے یا پاس؟ کے نمبر ملیں گے ہم کو؟"

رضیہ (ہنس کر) "صفر"

اکرام: "وہ کیوں؟ کیا غلط جواب دیا ہم نے"

رضیہ: "تو گویا آپ کو نقال بننا بہت پسند ہے۔ خدا کی قسم!

یہ ہمارا ہندوستان تو نقالوں کی منڈی ہو گیا ہے انگریز کو جس وضع قطع میں دیکھیں گے وہی سوانگ بنالیں گے۔ کسی کو اپنی تہذیب کا خیال ہی نہیں کسی کے دل میں مذہب کا احترام ہی نہیں"۔

اکرام۔ تم تو تب خوش ہو جو میں ڈاڑھی رکھ لوں۔ تنگ مہری کا پاجامہ پہنا کروں۔ سبز رنگ کی پگڑی سر پر ہو ہاتھ میں تسبیح اور عصا ہو۔ کندھے پر رومال ہو۔ آنکھوں میں کاجل ہو کتری کتری مونچھیں ہوں۔ کیوں جناب! مابدولت نے ٹھیک کہا نا"۔

رضیہ۔ "بالکل غلط!"

اکرام۔ آسمان کی طرف دیکھ کر۔ یا اللہ! آج تو بڑے پھنسے ہماری رضیہ تو پکی مولوی بن گئی۔ پہلے تو اس قسم کا وعظ کبھی سنا نہ تھا"۔

رضیہ۔ "وعظ کیسا؟ میں تو ذرا آپ کی محبت کا امتحان کر رہی تھی۔ کچھ اصل حقیقت بھی ہے یا سب دکھاوا ہی ہے"۔

اکرام۔ "اوں ہوں!" یہ اپنے ہی دل سے پوچھئے"۔

رضیہ۔ "اپنے دل سے کیا خاک پوچھوں جب آپ کو خود ہی ہی میری خوشی کا خیال نہیں تو پھر میرا کہنا ہی فضول ہے"۔

اکرام (ہنس کر) بس آگئیں نا اوچھے ہتھیاروں پر۔ رضیہ! یہ ناراضگی کیسی۔ ہم جیسے ہنس ہنس کر باتیں کر رہے ہیں تم بھی تو اسی طرح ذرا ہنس کر بات چیت کرو یا قائل کرو یا قائل ہو جاؤ۔"

رضیہ (شوہر کی طرف دیکھ کر) "کس سے!"

اکرام "ہم سے۔ اپنے میاں سے۔ مسٹر اکرام سے۔"

رضیہ "سب کہنے کی باتیں ہیں۔ مسٹر اور میاں!

اکرام "اچھا صاف صاف کہو تم چاہتی کیا ہو۔"

رضیہ "کہوں"

اکرام "شوق سے۔"

رضیہ "وعدہ کیجئے۔"

اکرام "کیسا!"

رضیہ "جو کچھ میں کہوں گی آپ کو ماننا ہوگا"

اکرام "یہ تو اچھی رہی۔ خواہ ہم نے جرم نہ بھی کیا ہو اور تم اقبال جرم کو کہو تو ہم کیسے مان لیں سنو جی! جو بات ماننے کی ہو گی وہ تو ہم ضرور مان لیں گے۔ اور جو بات تم غلط کہو گی وہ نہیں مانیں گے۔"

رضیہ "میں غلط کیوں کہنے لگی"
اکرام (ہنس کر) ٹھیک ہے۔ لیکن عورتوں کی باتیں عموماً غلط ہی ہوا کرتی ہیں"
رضیہ "اور مرد عموماً جھوٹ ہی بولا کرتے ہیں۔
اکرام۔ (ہنس کر) یہ بہتان مجھ پر۔ رضیہ! اپنے دل سے پوچھو۔ کبھی کوئی بات غلط کہی آج تک"
رضیہ "میں نے کب کہا۔ لیکن یہ بھی تو کہئے کہ کبھی میری بات بھی آپ نے مانی آج تک کہئے!'
اکرام "اچھا صاحب! منوائیے کیا کیا منوانا ہے آپ کو"
رضیہ "مسلمانوں ایسی شکل وصورت بنائیے"
اکرام (انگلی پر گنتے ہوئے) آرڈیننس نمبر ۱ آگے چلئے۔
رضیہ "نماز پڑھا کیجئے۔
اکرام۔ آرڈیننس نمبر ۲۔ ہاں صاحب!"
رضیہ "سگرٹ پینا چھوڑ دیجئے۔ مجھے اس سے سخت نفرت ہے اس کی بدبو سے میرا دماغ پھٹنے لگتا ہے۔
اکرام۔ آرڈیننس نمبر ۳ آگے فرمائیے!
رضیہ "مونچھیں مونڈنی ترک کر دیجئے۔

اکرام۔ "آرڈیننس نمبر ۲۔ ارشاد؟"

رضیہ: "بس، پہلے ان کی حامی بھر لیجیے اور جتنی وعدہ کیجیے اس کے بعد پھر دیکھا جائے گا۔"

اکرام: "گویا میگزین میں ابھی اور بھی گولہ بارود باقی ہے۔"

رضیہ: "فرمائیے! کیا ارادہ ہے؟ ٹال مٹول سے کام نہ چلے گا۔"

اکرام نے مسکرا کر بیوی کی طرف دیکھا پھر کوٹ کی جیب سے سگریٹ کی ڈبیا نکالی۔ لیکن رضیہ نے ڈبیہ چھین کر باہر پھینک دی۔ اکرام ہاتھ پر ہاتھ رکھ کر بیٹھ گیا۔

"اب یہ خاموشی کیوں سادھ لی آپ نے"۔ رضیہ نے پوچھا

"شکر ہے!" اکرام نے ایک آہ بھر کر کہا۔ "لیکچر تو ختم ہوا۔ خیر! بندے کو بھوک لگ رہی ہے کچھ کھلوائیے۔ خالی پیٹ ہو تو کوئی بات ٹھیک نہیں سوجھتی۔"

"ابھی آپ کو کھانا نہیں مل سکتا" رضیہ نے جواب دیا۔

"کیوں؟" اکرام نے پوچھا۔ کیوں نہیں مل سکتا۔"

"میری مرضی!" رضیہ نے مسکرا کر جواب دیا۔

"آخر کچھ وجہ بھی" اکرام نے پوچھا۔ یا ایسے ہی دھونس جمائی

جا رہی ہے"

"پہلے وعدہ کیجئے" رضیہ نے کہا "کہ جو کچھ میں نے کہا ہے آپ کو منظور ہے"

"نہیں!" اکرام بولا "ہرگز نہیں"

"بہت اچھا" رضیہ اٹھتے ہوئے بولی "بس آج سے مجھ سے بھی مت بولا کیجئے"

لیکن اکرام نے بیوی کا ہاتھ پکڑ کر اسے پاس بٹھالیا اور کہا "دیکھئے جناب! کچھ آپ رعایت کیجئے۔ کچھ ہم جبر سے کام لیں گے"

"میں معمے نہیں سمجھ سکتی" رضیہ نے جواب دیا "صاف صاف کہئے۔ منظور ہے یا نہیں؟"

اکرام دو ایک بار کھنکار کر بولا۔

"سنئے! تمہارے کمرے میں سگرٹ نہیں پیا کریں گے۔ مونچھیں مونڈنی چھوڑ دیں گے۔ نماز ہم سے نہیں پڑھی جائے گی۔

(رضیہ کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لے کر) "اب تو خوش ہوئیں شکر ہے۔ کفر ٹوٹا خدا خدا کر کے"

"سنئے!" رضیہ بولی "نماز آپ کو ضرور پڑھنی ہوگی۔ سگرٹ

پینے کی میں اجازت نہیں دوں گی"

"رضیہ!" اکرام نے کہا "ذرا دل میں سوچو تو سہی کہ انسان صبح سویرے کیسے اٹھ سکتا ہے۔ وہی تو سونے کا وقت ہوتا ہے۔ پھر بار بار وضو کرنے سے اور اٹھنے بیٹھنے سے کپڑوں میں سلوٹ پڑ جائیں گے۔ ہاں! تم کہو تو محض تمہاری خاطر سے صبح کی نماز جب ہم اٹھا کرتے ہیں پڑھ لیا کریں گے۔ ہمارے خیال میں تو ایک بھی نماز توجہ سے پڑھ لی جائے تو باقی نمازوں کی ضرورت ہی نہیں رہتی۔"

"کتنا افسوس ہے" رضیہ نے جواب دیا۔ کہ ان کپڑوں کی خاطر آپ کپڑے دینے والے کو ناراض کر رہے ہیں۔ رہا آپ کا سویرے اٹھنا تو فکر مت کیجئے۔ میں آپ کو جگا دیا کروں گی۔ آخر میں بھی تو صبح اٹھتی ہوں۔"

"شکریہ!" اکرام نے ہنس کر کہا "آپ سے یہ نیکی نہ ہوگی تو اور کس سے ہوگی۔ کچھ ٹھکانا ہے آپ کی محبت کا اب صبح صبح ہمیں سونا بھی نصیب نہیں ہوگا۔ گویا دن جمائیاں لینے ہی گذرا کرے گا۔"

"جمائیاں لینے کیوں گذرا کرے گا" رضیہ نے جواب دیا۔ کام

کاج میں گذرے گا۔"

اکرام (ہنس کر) "برے پھنسے آج تو۔"

رضیہ "ہوا نا وعدہ۔ دیکھئے اب بھولئے گا نہیں!"

اکرام "اچھا صاحب! ہم سمجھ لیں گے کہ ہمارے ہاں مارشل لا (فوجی قانون) جاری ہے۔ دل سے منظور۔ جان سے منظور۔ اپنی پیاری رضیہ کی خاطر سب کچھ منظور۔"

رضیہ "تو اٹھئے عصر کی نماز پڑھ لیجئے۔ میں ماما سے گرم پانی لانے کو کہتی ہوں۔ آپ ذرا کوٹ اتار دیجئے۔ پھر آپ چائے پئیں گے میں پاس بیٹھ کر گراموفون بجاؤں گی۔ ٹھیک ہے نا"

اکرام۔ ہنس کر بولا۔

رضیہ! ٹھہرو۔ جلدی مت کرو۔ میں نے مولویوں سے سنا ہے کہ جلدی کے کام شیطان کے ہوتے ہیں۔ آج تم سے وعدہ تو کر لیا ہے۔ کل سے عمل شروع کر دیں گے۔ ٹھیک ہے نا!"

رضیہ (ہنس کر) "جس کام میں بندی کا ہاتھ ہوگا انشاءاللہ اس سے شیطان کوسوں بھاگے گا۔" وعدہ چونکہ آج سے ہوا ہے اس لئے عمل بھی اسی وقت ہوگا۔"

الغرض رضیہ نے گرم پانی منگوا کر اکرام کو وضو کروایا اور مصلا بچھا کر نماز کے لئے کھڑا کر دیا۔ اور میاں اکرام نے بھی آنکھ جھپکنے میں نماز ختم کر لی۔ پھر چائے پینے لگے۔ رضیہ نے دو ایک ریکارڈ سنائے۔ پھر جو گھر سے نکلا تو پورے دس بجے واپس آیا اور آتے ہی کھانا مانگا۔ رضیہ نے کہا۔

"صبر کیجئے۔ کھانا گرم ہو لے پھر منگواؤں گی"

"تو لائیے" اکرام نے کہا "کوئی ریکارڈ ہی سنیں"

"نماز نہیں پڑھئے گا۔ کیا؟" رضیہ نے پوچھا۔ "کبھی معلوم ہوتا ہے آپ نے مغرب کی بھی نہیں پڑھی"

اکرام نے ہنس کر کہا "ٹینس کھیلنے میں اس کا تو خیال ہی نہ رہا"

"کچھ مذائقہ نہیں" رضیہ نے شوہر کی طرف مسکراتے ہوئے دیکھ کر کہا "آج ایسی سزا ملے گی پھر نہ بھولیں گے آپ"

خیر اب عشاء کی پڑھ لیجئے۔ پانی تیار رکھا ہے"

"اب تو غالباً وقت نہیں رہا" اکرام نے ایک جمائی لے کر کہا۔

"بہت وقت ہے" رضیہ نے اکرام کا ہاتھ پکڑ کر کہا۔ اٹھئے

وضو کر لیجئے"

"ذرا صبر تو کرو" اکرام بولا "بہت تھک گیا ہوں آج"

"کہاں گئے تھے؟" رضیہ نے پوچھا۔

"ذرا سینما دیکھنے چلا گیا تھا" اکرام نے جواب دیا۔

"آپ ہر روز سینما دیکھنے کیوں جاتے ہیں" رضیہ نے پوچھا۔

"وقت کٹ جاتا ہے" اکرام نے جواب دیا۔

"گویا آپ کو اور کوئی کام ہی نہیں، سوائے دوستوں سے گپ لڑانے یا سینما میں وقت ضائع کرنے کے" رضیہ نے پوچھا۔

"کام کرنے کو تو عمر پڑی ہے" اکرام نے جواب دیا "اللہ روزی دے رہا ہے۔ مزے سے بسر ہو رہی ہے"

"ایک بات عرض کروں" رضیہ نے مسکرا کر کہا۔

"یا میرے اللہ!" اکرام نے بیوی کی طرف دیکھتے ہوئے کہا "رحم تیرا۔ آج کیسا منحوس دن چڑھا تھا کہ صبح سے ہم پر پابندیاں عائد ہو رہی ہیں۔ رضیہ! خدا کی قسم! اگر بابا آدم علیہ السلام کو یہ معلوم ہوتا کہ بی بی حوا کی بیٹیاں ان کی غریب اولاد پر یوں حکم چلایا کریں گی تو خدا سے کبھی حوا کی آرزو نہ کرتے۔ جناب! یہ ہمارا

ہی دل گردہ ہے کہ بلا چون وچرا صبح سے آپ کے احکام کی تعمیل کر رہے ہیں۔ اب فرمائیے! کیا ارشاد ہے"

"واہ صاحب!" رضیہ نے جواب دیا۔ "آپ جس دن کو منحوس کہہ رہے ہیں آپ ہی کے سر کی قسم! میں تو اسے اپنی زندگی کا سب سے مبارک دن سمجھ رہی ہوں کہ میرے شریک زندگی نے ایک مدت کے بعد اللہ کے آگے جبین نیاز جھکائی آپ حوا کی بیٹیوں کو کوستے ہیں۔ حوا کی غریب بیٹیاں تو جناب آدم علیہ السلام کے صاحبزادوں کی ہمیشہ ہاتھ بندھی غلام ہی رہیں لیکن آدم کے بیٹے کبھی راہ پر نہ آئے۔"

"رضیہ!" اکرام نے صوفے پر لیٹتے ہوئے کہا۔ "منگواؤ بھی کھانا۔ میری تو انتڑیاں اب قل ھو اللہ پڑھنے لگیں۔"

"انتڑیوں کے قل ھو اللہ پڑھنے سے کھانا آپ کو نہیں مل سکتا۔" رضیہ نے ہنس کر جواب دیا۔ "ہاں! جب آپ قل ھو اللہ پڑھیں گے پھر کھانا ملے گا۔"

"اچھا رضیہ! کبھی سمجھ لیں گے تم سے۔ خیر! وضو تو عصر کے وقت کیا ہی تھا۔ لو تم کھانے کو کہو ہم نماز پڑھے لیتے ہیں۔"

"نہیں!" رضیہ بولی۔ "پہلے وضو کر لیجئے۔ پھر نماز پڑھئے

اٹھئے۔ کوٹ اتاریئے (ہنس کر) آج سگرٹ تو نہیں پیئے۔"

"پیئے تھے!" اکرام نے بناوٹی ناراضگی سے جواب دیا۔ اور کھانے کے بعد بھی تمہارے کمرے میں ہی پیئں گے۔ بس یہی سزا ہے تمہاری۔"

"دیکھا جائے گا۔" رضیہ نے شوہر کا کوٹ اتروا تے ہوئے کہا۔ پھر اس نے وضو کروایا اور نماز کے لئے کھڑا کر دیا۔

اگلے روز دن چڑھتے ہی رضیہ نے پہلے خود نماز پڑھی پھر اکرام کو بصد مشکل اٹھایا۔ اس اللہ کے بندے نے اٹھتے اٹھتے ہی سات بجا دیئے۔ بہر کیف رضیہ نے صبح کی نماز پڑھوا دی جب اکرام نماز پڑھ چکا تو رضیہ نے کہا "لیجئے! اب سو رہئے"

"واہ!" اکرام بولا۔ "اب کیا سوئیں گے پھر پلنگ پر بیٹھ کر تکیے کے نیچے سگرٹ کی ڈبیا ٹٹولنے لگا لیکن وہ تو پہلے ہی غائب ہو چکی تھی۔ ہنس کر بولا۔

"اوہو یہاں تو مارشل لا جاری ہے۔ کیوں جی! چائے بھی ملے گی یا آج ہوا ہی کھائیں گے۔"

جب دونوں چائے پی چکے تو رضیہ نے پوچھا۔

"اب کیا ارادہ ہے؟"

"ارادہ کیسا؟ اکرام نے جواب دیا۔" ذرا گپ شپ ماریں گے۔ تاش واش کھیلیں گے۔"

"آپ نے پڑھنا کیوں چھوڑ دیا" رضیہ نے پوچھا۔

"شادی جو ہو گئی" اکرام نے جواب دیا۔" آپ جو تشریف لے آئیں۔"

"تو گویا!" رضیہ نے کہا۔ میں ہی ایسی سبز قدم ہوں کہ آپ میری وجہ سے ایک اچھے کام سے رک گئے۔

"کیا کہہ رہی ہو رضیہ!" اکرام نے کہا۔" خدا کی قسم! تم نے تو میری دنیا ہی بدل دی۔ ایف اے تو پاس کر چکا ہوں۔ اب تم کیا چاہتی ہو؟"

کم از کم بی اے تو ہونا چاہئیے" رضیہ نے جواب دیا" یہ بھی کوئی زندگی ہے کہ سارا دن گپ بازی میں گذر جائے۔"

"اب سارا دن کیسے گذرے گا۔" اکرام ہنس کر بولا۔" نماز بھی تو گلے آپڑی۔ اب تو دن بھر اسی کی تیاری ہوا کرے گی"

"سبحان اللہ!" رضیہ نے جواب دیا۔" بہت احترام ہے آپ کے دل میں اسلام کا۔ توبہ کیجئے۔ سنئے! میرا دل چاہتا

ہے کہ آپ آج ہی سے بی، اے کی تیاری شروع کر دیں۔ کوئی ٹیوٹر مقرر کر لیجئے۔"

"کیوں؟" اکرام نے پوچھا۔

"ایک تو مطالعہ میں وقت گذرے گا۔ دوسرے آپ بی، اے ہو جائیں گے۔ تیسرے فضول باتوں میں وقت ضائع نہ ہوگا" چوتھے ...... اتنا کہہ کر رضیہ رک گئی۔

"چوتھے کیا؟ اکرام نے پوچھا۔ "اب یہ بھی کہہ دیجئے۔ کون روکتا ہے آپ کو؟"

"میرا دل خوش ہوگا" رضیہ نے مسکرا کر جواب دیا۔ "سہیلیوں میں میری عزت ہوگی۔"

"کل سے نمازی تو بن گیا ہوں" اکرام نے مسکرا کر کہا۔ بقول تمہارے کچھ شکل بھی مومنوں جیسی ہو رہی ہے۔ اور تم کیا چاہتی ہو اب"

"صبر کیجئے!" رضیہ ہنس کر بولی "جو کچھ میں چاہتی ہوں وقت پر آپ کو معلوم ہو جائے گا۔"

اکرام ہنس کر بولا۔

"معلوم ہوتا ہے گھر میں ہمارے خلاف کچھ سازش ہو رہی

ہے۔ اماں تو کبھی کچھ کہتی نہیں۔ اور تم بھی تو اتنی نامہربان نہ تھیں"
رضیہ۔ "میں تو لونڈی ہوں آپ کی خدمت بھی میرے لئے
عبادت ہے۔ آپ کا حکم میرے لئے ایک قسم کا فرض ہے"
اکرام۔ "حکم تو فرض ہو یا نہ ہو" لیکن کیا ہماری بھی ایک
درخواست قبول ہو گی"

رضیہ۔ "دل سے جان سے"
اکرام۔ "تو بھئی! سگرٹ پینے کی اجازت دیدو"
رضیہ۔ مسکرانے لگی۔
"منظور ہے!" اکرام نے پوچھا۔
"منظور!" رضیہ نے ہنس کر کہا۔ "لیکن آپ کو بی، اے
کی ڈگری ضرور لینی ہو گی"
"اور اس کے بعد؟" اکرام نے پوچھا۔ "جو کچھ حکم دینا ہے
ابھی بتلا دو۔ تاکہ پہلے ہی خوب سوچ سمجھ لیں"
"پہلے آپ ڈگری تو لیں"۔ رضیہ نے ہنس کر کہا۔ "پھر اور
بھی دیکھا جائے گا"
"بہت اچھا! منظور ہے" "آج ہی کسی ٹیوٹر سے صلاح
کریں گے" اکرام نے جواب دیا۔

"اور دیکھئے" رضیہ بولی "خدا کے لئے نماز وقت پر پڑھ لیا کریں۔ آپ نہیں جانتے کہ آپ کو نماز میں کھڑے دیکھ کر مجھے کتنی خوشی ہوتی ہے۔"

"سنو جی!" اکرام نے کہا "جب مطالعہ شروع کریں گے تو گھر ہی میں تو ہوا کریں گے۔ نماز پڑھوانی ہے تو خود پڑھوا لیا کرو۔"

"منظور ہے!" رضیہ نے مسکرا کر کہا۔

"لو!" اکرام نے پوچھا "اب تو کوئی اور شرط باقی نہیں رہی۔"

"شرط کیسی؟" رضیہ نے میاں کی طرف دیکھ کر کہا "یہ کہئے کہ اب اور تو کوئی درخواست نہیں۔"

"جو کچھ بھی تم کہو" اکرام نے کہا۔

"عورت کی درخواستیں کبھی ختم نہیں ہوئیں۔" رضیہ نے ہنس کر کہا "جیسے جیسے ضرورت پڑے گی۔ عرض کر دیا کروں گی۔"

"اور جو ہم بھی کسی روز اکڑ گئے۔" اکرام نے مسکرا کر پوچھا۔

"آپ اکڑیں گے" رضیہ نے مسکرا کر پوچھا "مجھ سے؟ ہے ہمت؟"

"نا بابا!" اکرام نے ہنس کر کہا "ڈرتے ہیں کہیں کوئی اور آرڈیننس نہ لگ جائے"

"آرڈیننس تو اب کیا لگے گا" رضیہ نے شوہر کی طرف محبت بھری نگاہوں سے دیکھتے ہوئے کہا "ہاں یہ کہئے کہ

ع "قافلہ ہو گیا آسودۂ منزل میرا!!"

نئی روشنی!

یادش بخیر! بڑی بی جب تک دن بھر میں دس گھر نہ جھانک لیں ان کا کھانا ہضم نہیں ہوتا تھا۔ ابھی ایک گھر سے نکلی ہے تو جان پہچان کے کسی دوسرے گھر میں گھس رہی ہیں۔ یہاں کی وہاں اور وہاں کی یہاں اور وہ بھی خوب مرچ مصالحہ لگا کر کہہ رہی ہیں۔ رائی کا پہاڑ بنا دینا تو بڑی بی کے لئے کوئی ایسی بات ہی نہ تھی۔ اب کوئی سنے یا نہ سنے۔ لیکن وہ بڑی بی ہی کیا جو بات ختم کئے بغیر رہیں۔ رہی زبان تو بس قینچی کی طرح چل رہی ہے۔ اور زبان سے زیادہ ہاتھ۔ گویا زبان اور ہاتھ سے جو کچھ کہنا ہے نقشہ کھینچ کر بھی دکھا رہی ہیں۔

سکینہ کے گھر پہنچیں تو ہانپ رہی تھیں۔ ایک سانس اوپر ایک سانس نیچے۔ چہرے پر ہوائیاں اڑ رہی تھیں۔ جاتے ہی کھاٹ پر بیٹھیں نہیں بلکہ گر پڑیں۔

"خیر تو ہے بڑی بی؟" سکینہ نے مشین چلاتے ہوئے پوچھا۔ "یہ ہانپ کیوں رہی ہو۔ گلی میں کوئی کتا تو کاٹنے نہیں دوڑا تھا؟"

"ہاں بیٹی!" بڑی بی نے جواب دیا۔ "اب یہی ایک بات باقی تھی۔ کتے سے بھی کٹوا لو۔ یہ حسرت بھی تمہارے دل میں رہ نہ جائے۔ آخر کچھ انعام بھی تو ملنا چاہئے۔ صاف کیوں نہیں کہہ دیتیں کہ مت آیا کرو میرے یہاں۔ مجھے تمہاری محبت یہاں کھینچ لاتی ہے۔ ورنہ وہ بھی تو ہیں جو صبح سے شام تک بیٹھی میری راہ دیکھا کرتی ہیں۔ ایک روز نہ جاؤں تو بار بار خبر پچھوا بھیجتی ہیں"

سکینہ ہنس کر بولی

"معلوم ہوتا ہے کسی سے لڑ جھگڑ کر آئی ہو۔ لیکن نزلہ مجھ پر کیوں گرنے لگا۔ قسم لے لو۔ میں تو بیٹھی تمہاری ہی راہ دیکھ رہی تھی۔"

"جگ جگ جیو بیٹی!" بڑی بی نے جھٹ خوش ہو کر کہا "قسمت تھی جو آج بچ گئی۔ ورنہ اس وقت تم میری لاش پر

بیٹھی روتیں۔" اتنی عمر گذر گئی لیکن انگریز کے راج میں اتنا ہلڑ مچتا تو آج تک نہ دیکھا تھا"۔

"ہوا کیا؟" سکینہ نے پوچھا۔

"ہونا کیا تھا" بڑی بی نے جواب دیا۔ "مدرسہ میں چھٹی ہوئی تھی۔ لڑکیاں باہر نکل رہی تھیں۔ بستہ بردار عورتیں بستے اٹھائے ساتھ تھیں۔ کوئی آگے کوئی پیچھے۔ لڑکیوں نے رنگ برنگ کے برقعے اوڑھ رکھے تھے کسی کا کاسنی اور کسی کا سرمئی۔ کسی کا چمپئی کسی کا سیاہ اور کسی کا عنابی۔ توبہ ہے سکینہ! شریف زادیاں تو ہمیشہ سپید رنگ کے برقعے اوڑھا کرتی تھیں۔ یہ نہیں کہ ایک دنیا کی راہ جاتے نظر پڑے۔ پھر برقعہ پر ہی تو بس نہیں۔ ذرا ان کے جوتے تو دیکھو۔ کوئی بند کوئی کھلا۔ کوئی جالیدار کوئی بیچ میں سے پھٹا ہوا۔ اور کبھی ایڑی کی طرف بھی تم نے نگاہ ڈالی، ایڑی کا ہے کو ہے معلوم ہوتا ہے ایڑی کی بجائے شطرنج کا مہرہ لگا رکھا ہے۔ اور بازاروں میں کچھ اس طرح ٹھمک ٹھمک چلتی ہیں کہ بس آہی گیا ملک میں عورت کا راج! اور مرد کو حکم ہے کہ آنکھیں بند کر کے راستہ چلے! گویا باوا کا حکم چلتا ہے۔"

"توبہ ہے!" سکینہ نے ہنس کر کہا۔ "یہ تمہید کبھی ختم بھی ہوگی

تو کیا لڑکیاں تمہیں مارنے کو دوڑی تھیں یا کسی نے "بڑی بی" کا
آوازہ کس دیا تھا؟

بڑی بی نے سکینہ کی طرف دیکھا اور کہا۔

"بیٹی! ابھی تو انگریز کا راج ہے۔ عزت آبرو کا خوف تو جب
ہو گا جب کانگریس کا راج ہو گا۔ مجال ہے کسی کی جو آنکھ اٹھا کر
بھی میری طرف دیکھے"

"ارے!" سکینہ نے ہنس کر کہا۔ "تم بھی کانگرس کو جانتی
ہو۔ یا محض نام ہی سن رکھا ہے"

بڑی بی بولیں۔

"نام کیوں سن رکھا ہے۔ آئے دن ان لوگوں کے جلوس
جلسوں میں بھاگڑ جو پڑتی ہے تو کون نہیں جانتا کہ بھاگنے
والوں کو کانگرس کہتے ہیں"

سکینہ ہنس کر بولی۔

"بس! اسی پر لقمان بنی پھرتی ہو۔ کانگرس تو ایک
جماعت کا نام ہے۔ اور گاندھی جی اس کے کرتے دھرتا
ہیں اور ...."

بڑی بی بات کاٹ کر بولیں

"جانتی ہوں جانتی ہوں! مسلمانوں کو ہندوستان سے باہر نکالنے کو جو جتھا ہندوؤں نے بنا رکھا ہے اسے کانگرس ہی تو کہتے ہیں اور یہ بھی تو کانگرس ہی کا حکم ہے کہ انگریزی نوکری کرو۔ انگریز کا نمک کھاؤ۔ لیکن حکم مانو گاندھی کا۔"

سکینہ کہنے لگی۔

"بس ٹھیک ہے۔ تو خیر! پھر ہوا کیا؟"

بڑی بی بولی۔

"ہونا کیا تھا سکینہ"۔ بازار میں دو سانڈ لڑ رہے تھے۔ ایک کالا ایک سپید۔ کالے والے کو ہندو بڑھا رہے تھے اور سفید کی حمایت پر مسلمان تھے۔ میں بھی ایک طرف کھڑی یہ تماشہ دیکھ رہی تھی سپید نے جو کالے کو ایک ریلا دیا تو بس لوگوں میں ہلڑ مچ گیا۔ جدھر کسی کے سینگ سمائے ادھر ہی کو اٹھ بھاگا۔ موؤں نے اتنا بھی نہ دیکھا کہ بڑی بی ایک طرف کھڑی ہیں۔ اب تم ہی خدا لگتی کہو بیٹی! اگر کہیں میرا پاؤں پھسل جاتا تو کیا آج زندہ بچتی۔ لیکن اللہ قسم! میں نے بھی ہاتھ اٹھا اٹھا کر وہ کوسنے دیئے کہ فرشتے بھی آسمان پر کان پکڑتے ہوں گے۔ لیکن یہ کہا سی رہی ہو کہیں بیاہ شادی میں جانا ہے تمہیں۔ کس کے گھر سے بلاوا آیا ہے؟

بیاہ شادی میں تو میں بھی بیسیوں گھروں میں جاتی ہوں مجھے تو آج کہیں سے بلاوا نہیں آیا۔"

سکینہ بولی۔

"بیاہ شادی میں تو کہیں جانا نہیں۔ ہاں! آج ذرا سینما جانے کا ارادہ ہے۔"

"تم جاؤگی؟" بڑی بی نے تعجب سے پوچھا۔ "شن ماں"

سکینہ ہنس کر بولی۔

"بڑی بی! شن ماں نہیں۔ سینما کہو۔ تم تو ماں کو سنا رہی ہو۔"

بڑی بی نے ناک سکوڑ کر کہا۔

"پھر وہی غلطی! سو بار کہہ چکی۔ کہ فرنگی کے لفظ زبان پر آنے سے ناپاک ہو جاتی ہے جانے تمہیں کیا ضد ہے کہ نکمی بات پر ہمیشہ اصرار کئے جاتی ہو۔ تو تم شن ماں جاؤ گی۔"

"میں ہی تو ایک نہیں جاؤں گی"۔ سکینہ نے جواب دیا۔ "پڑوس والیاں بھی دو چار ساتھ ہوں گی۔"

"ہوں!" بڑی بی نے اس ہوں کو لانبا کر کے کہا۔ جاؤ بیٹی شوق سے جاؤ۔ ذرا تھوڑا سا چونا منہ پر اور پوت لو۔ رنگ روپ نکھر آئے گا۔ دونوں جہان کا ثواب بھی تو تب ہی ہے جب ایک

دُنیا دُشمن کرے۔ وہ شمن کرنے والے سے تو پاپ کٹتے ہیں۔ توبہ ہے! توبہ! میں تو جب "شمن ماں" کا نام بھی سن لیتی ہوں تو تن بدن میں ایک آگ سی لگ جاتی ہے۔ آگ لگے ایسے شوق کو جس سے ناک بھی کٹے اور خاندان کے نام پر حرف بھی آئے اور قومی غیرت کو بٹہ بھی لگے۔"

"بڑی بی! سکینہ نے پوچھا۔ سینما جانے سے ناک کیوں کٹتی اور خاندان کے نام پر حرف کیسے آئے اور قومی غیرت کو بٹہ کیسے لگے۔ یہ تو ترقی کا زمانہ ہے۔ تعلیم کا زمانہ ہے۔ اگر ہم زمانے کا ساتھ نہ دیں گے تو زمانہ کب ہمارا ساتھ دے گا۔

"کون منع کرتا ہے بیٹی!" بڑی بی نے جواب دیا۔ بے شک یہ ترقی کا زمانہ ہے۔ اور تعلیم بھی گھر گھر عام ہو رہی ہے۔ لیکن کیسی ترقی اور کیسی تعلیم! ترقی تو ہم لوگوں نے یہ کی کہ شکل و صورت سے بھی اب مسلمان معلوم نہیں ہوتے۔ اور تعلیم ہم نے یہ پائی کہ نہ خدا کا خوف رہا نہ اس کے رسولؐ کا ادب! رہا غازہ وازہ! تو محض بے کار! خدا کی قسم! مجھے اگر معلوم ہوتا کہ تم بھی اس گندی ناؤ میں بہے جا رہی ہو تو تمہارے گھر کا پانی پینا بھی حرام سمجھتی۔ ارے! کہاں ہم شریف زادیاں جن کی پرچھائیں فرشتے بھی نہ دیکھ پائیں

اور کہاں اب کھلے بندوں بازاروں میں دھکّے کھاتی پھرتی ہیں۔ شکل صورت دیکھ کر لاحول پڑھنے کو دل چاہتا ہے۔ حیرانگی تو یہ ہے کہ انگریز کے راج میں لامذہبی کی وبا پھیل رہی ہے۔ ہاں رام راج میں یہ خرابی پیدا ہوتی تو تعجب نہ ہوتا۔ کیونکہ رام راج کا مطلب ہی یہی ہے۔ کہ نہ کوئی مسلمان رہے نہ مسلمان کا مذہب۔ مجھے تو ان مسلمانوں کی غیرت اور حمیت پر تعجب ہوتا ہے جو لاٹ صاحب کی کونسل میں بیٹھ کر آئے دن ہم پر ٹیکس لگواتے ہیں۔ یہ پانی کا ٹیکس ہے۔ یہ مکان کا ٹیکس ہے۔ یہ مکان کی زمین کا ٹیکس ہے۔ اب دیکھیں ہوا پر اور سانس لینے پر کب ٹیکس لگتا ہے۔ شہر میں کھانے کو آٹا نہیں ملتا۔ مٹی کا تیل لینے جاؤ تو عطر کا بھاؤ بتاتے ہیں اور یہ لوگ ہیں کہ لاٹ صاحب کی کونسل کے ممبر بنے اکڑے پھرتے ہیں۔ بات تو تب تھی سکینہ! جو عورتوں کے متعلق بھی کوئی حکم پاس کرواتے۔"

سکینہ بولی۔

بڑی بی! معلوم ہوتا ہے کہ تمہیں یہ کسی حکیم نے بتلا رکھا ہے کہ جو لفظ زبان سے نکالو غلط ہی نکالو۔ جیسے تم ٹیکس کہتی

ہو ٹھیک لفظ کس ہے۔ اور نہیں تو ایسے دو چار لفظ صحیح تو یاد کر لو لیکن چھوڑو اس قصے کو۔ تم ابھی کہدو کہ فرنگی کا لفظ زبان پر آنے سے وضو کرنا پڑتا ہے۔ ہاں! یہ تو بتاؤ عورتوں کے متعلق تم کیسا حکم پاس کروانا چاہتی ہو؟"

"میں بتاؤں؟" بڑی بی بولیں "تم بھی تو آنکھیں رکھتی ہو۔ خدا نے عقل بھی دے رکھی ہے۔ "سُن ماں" کے پاس تو تم بھاگی جاتی ہو۔ اور پوچھتی مجھ سے ہو کہ کیسا حکم پاس ہو۔ بیٹی! یہ ننگی فیشن (؟) تو کسی دن قوم کو لے ڈوبیں گی۔ ہر روز دیکھتی بھی ہو اور پوچھتی مجھ سے ہو۔ لو میں ہی بتا دیتی ہوں۔ تم ان لڑکیوں کو تو ہر روز مدرسے جاتے دیکھتی ہو۔ جسے دیکھو دوپٹہ گلے میں پڑا ہوا ہے۔ ننگے سر بھاگی جا رہی ہیں۔ اب کوئی پوچھے ان سے کہ دوپٹہ اگر سر ڈھانپنے کے لئے نہیں تو کیا پھانسیاں لینے کے لئے گلے میں ڈال رکھا ہے اب بتاؤ تم ہی ہمارے لیڈروں کا یہ فرض ہے کہ لاٹ صاحب سے کہہ سن کر کوئی ایسا حکم پاس کروا دیں کہ لڑکیاں بازاروں میں سر کھول پر اور میں تو یہاں تک کہدوں کہ گھروں میں بھی ننگے سر نہ پھرا کریں سکینہ! میں تو ڈنکے کی چوٹ کہدوں کہ ہماری یہی لڑکیاں ایک دن قوم کی ناؤ ڈبا کر رہیں گی۔ بیٹی! جس قوم کی عورتوں میں غیرت

نہ ہو شرم نہ ہو وہ قوم آج بھی رسوا ہوئی اور کل بھی رسوا ہوئی۔ تم چاہو تو میرا آج کا کہا دیوار پر لکھ رکھو۔ کہ اگر اس لامذہبی کی روک تھام نہ رہی تو پھر نہ تمہاری آبرو رہے گی اور نہ میری۔!"

جب بڑی بی کہہ چکیں تو سکینہ بولی۔

"بڑی بی! اتنی بات تو میں بھی تسلیم کرتی ہوں کہ غیر اقوام کی دیکھا دیکھی ہماری لڑکیاں بھی کچھ بے حجاب سی ہوتی جاتی ہیں لیکن تم بھی یہ اپنے سینے پر لکھ رکھو کہ جس قوم کی عورتیں تعلیم سے کوری ہوں گی وہ قوم کبھی ترقی نہیں کر سکتی اور......"

لیکن بڑی بی بات کاٹ کر بولیں۔

"بس رہنے دے یہ لن ترانیاں بیٹی!" کیا بھول گئی وہ مسلم لیگ کا جلسہ۔ میں تو اس دن پر ہزار لعنت بھیجتی ہوں۔ جس روز میں نے اس جلسہ میں قدم رکھا تھا۔ جلسہ تو تھا مسلمانوں کا۔ اور بڑے بڑے نام والے انگریزی طرز کے مسلمان بھی پرے کے پرے جمائے بیٹھے تھے۔ لیکن ایک طرف عورتوں کا بھی انتظام تھا۔ سکینہ! اب کیا کہوں تم سے! خدا وہ منظر تو دشمن کو بھی نہ دکھائے۔ کہنے کو تو عورتوں کے لئے پردہ کا انتظام کیا گیا

تھا۔ اور کچھ عورتیں پردے میں بیٹھی بھی تھیں۔ لیکن ایک دنیا کو اپنا بناؤ سنگار دکھانے کے لئے پردے سے زبردستی بے پردہ ہو رہی تھیں اور کچھ ایسی بھی شرم و حیا کی پتلیاں تھیں کہ سونگار کئے ایک دنیا کو دعوت تماشہ دے رہی تھیں۔ سکینہ! سچ مانو! میں تو خدا سے دعا کر رہی تھی کہ اے مولا کریم اپنے حبیبؐ کے صدقے یہ زمین پھاڑ دے اور میں سر سے پاؤں تک اس میں سما جاؤں۔"

سکینہ ہنس کر بولی۔

"تم تو اتنی اللہ والی بنتی ہو۔ پھر یہ دعا قبول کیوں نہ ہوئی یا ہو سکتا ہے کہ بلا وضو ہی دعا مانگی ہوگی۔"

بڑی بی ذرا غصہ سے بولیں۔

"بس سکینہ! مذہب کی بات میں مذاق حرام ہوتا ہے توبہ کرو اٹھو! کچھ اللہ کے نام کا خیرات کرو! بڑا کفر بولا تم نے! زمین تو ضرور پھٹتی۔ لیکن مولا کریم کو یہ منظور نہ تھا کہ مسلمانوں کی محفل میں میری یوں رسوائی ہو۔ لو! میں تو اب جاتی ہوں تمہیں بھی "سن ماں" دیکھنے جانا ہوگا۔ جاؤ! میں منع نہیں کرتی۔ لیکن واپس آکر غسل ضرور کر لینا اور کپڑے بھی بدل لینا۔"

سکینہ بولی۔

"اے بڑی بی! یہ کیا کہہ رہی ہو تم۔ جانے تم کس دنیا میں رہتی ہو۔ یہ زمانہ نئی روشنی کا ہے اور ترقی کا۔ پہلے تم نے سینما دیکھنے پر بلا سوچے سمجھے اعتراض ٹھونک دیا لیکن شاید تمہیں یہ معلوم ہی نہیں۔ یہ تو سائنس کی ایک بہت بڑی ایجاد ہے۔ پھر شاید تمہیں یہ بھی معلوم نہیں کہ فلم دکھاتے وقت بیرونی تمام روشنیاں بند کر دی جاتی ہیں لوگ اندھیرے میں بیٹھے فلم دیکھتے ہیں۔ عورتوں کی جانب پلٹ پلٹ کر نہیں دیکھتے۔ اور اگر کوئی موا دیکھے بھی تو پھر کیا' دیکھا کرے! کھا تو نہیں جائے گا۔ اٹھا کر لے تو نہیں بھاگے گا

ا عورت میں اگر غیرت ہو تو مرد کی مجال نہیں کہ میلی نگاہ سے اس کی طرف دیکھے۔ ہماری قومی پستی کا ایک سبب یہ بھی ہے کہ عورتوں کو وہ آزادی جو مذہباً ان کا حق ہے ابھی تک انھیں نہیں دی گئی پھر تمہیں یہ شکایت ہے کہ مسلمان عورتیں پردہ چھوڑتی چلی جا رہی ہیں۔ میں پوچھتی ہوں! پردہ ترک کرنے سے قوم پر زوال کیسے آ سکتا ہے۔ قوم پر زوال اس لئے آیا کہ مردوں نے انہیں بلا وجہ گھر کی چار دیواری میں قید رکھا۔ بڑی بی! ذرا خدا

لگتی کہو اکیا زندگی اسی کا نام ہے کہ دن بھر بھاڑ جھونکو۔ بچّے پیدا کرو۔ان کی پرورش کرو۔ اور قوموں کی عورتیں بھی تو تم دیکھتی ہو (ہنس کر) یا شاید غیر قوم کی عورت کی طرف دیکھنا بھی تمہارے مذہب میں حرام ہوگا۔ کس آزادی سے گھروں میں رہتی ہیں۔ تم کیا جانو ! اب تو عورتیں مردوں کے دوش بدوش مشاعروں میں بھی شامل ہونے لگیں۔ اب لگادو کفر کا ایک لمبا چوڑا فتوے ان پر بھی "

بڑی بی چپکی بیٹھی سکینہ کی باتیں سُن رہی تھیں۔ کبھی زمین پر تھوک دیتیں۔ کبھی بیٹھے بیٹھے توبہ ! توبہ ! کہہ کر دونوں کان پکڑلیتی جب سکینہ کہہ چکی تو بڑی بی بولیں ۔

" پھوڑے لئے جلے دل کے پھپھولے ! ابا ابھی کچھ اور بھی کہنا ہے تمہیں۔ بیٹی ! خدا قسم ! تمہارا اگر بس چلے تو آسمان کے راز بھی معلوم کرنے اُٹھ دوڑو ......"

سکینہ نے بات کاٹ کر اور ہنس کر کہا۔

" تو کچھ ہرج بھی ہے اس میں ! "

" ہرج تو کچھ بھی نہیں۔ صرف اوپر سے ایک آگ کا گولہ

مزاج پرسی کو آئے گا اور تم کو جلا کر خاک کر دے گا"

"اب لگیں کوسنے!" سکینہ ہنس کر بولی۔

"میں کیوں کسی کو کوسنے لگی"۔ بڑی بی: "جس طرح میں خاموش بیٹھی تمہاری کفر آمیز باتیں سنتی رہی ہوں۔ تم بھی میری دو ایک باتیں سن لو۔ پھر شوق سے اپنے "شن مان" میں چلی جانا۔ یہ لڑکیاں "شن مان" میں نہ جائیں۔ مجلسوں میں سوسنگار کر کے نہ بیٹھیں اور ماں باپ اپنی جوان لڑکیوں کو بازاروں میں ساتھ ساتھ نہ لئے پھریں تو انہیں اچھے شوہر کیسے ملیں۔ بیٹی! یہ بال میں نے دھوپ میں سپید نہیں کئے۔ بیٹی والے باپوں کی مجبوریاں یا شوق میں بھی خوب سمجھتی ہوں۔ میں تو جب کہوں گی سچ کہوں گی۔ ہاں! میں چونکہ غریب ہوں۔ اس لئے غریب کی بات ماننے اور سننے کے قابل ہوتی ہی کہاں ہے۔ غریب تو ہوں لیکن خدا کا شکر ہے بے غیرت نہیں۔ بیٹی! اتنا تو تم بھی مانو گی کہ اگر اس زمانے میں خدا کا خوف! اس کے حبیب کی محبّت دل میں غیرت۔ آنکھ میں حیا اگر کسی کے ہے تو وہ ہم غریب ہی ہیں۔ تم امیر لوگ تو راتوں کو مزے سے سوتے ہو اور ہم دعائیں مانگتے ہیں۔ مانو یا نہ مانو! یہ سب ہماری دعاؤں کا اثر ہے کہ تم

ایسی ملحد اور فرنگی قسم کی عورتوں پر کوئی آسمانی عذاب نازل نہیں ہوتا۔ ورنہ بیٹی! دیکھتیں تم کہ جو حال کافروں کا ہوا وہی تمہارا بھی ہوتا خدا بے انصاف نہیں بیٹی! ہماری طفیل تم پر بھی رحم ہو رہا ہے۔ ورنہ گیہوں کے ساتھ گھن بھی پس جاتا۔ لو ایک شادی کا حال سنو! مسلمانوں کا بیاہ تھا۔ بڑے ٹھاٹھ سے برات آئی دولہا میاں تو شکل وصورت سے عورت نما اور لباس سے پورے کرپانی معلوم ہوتے تھے۔ خیر نکاح تو ایک مولوی جی نے ہی پڑھا لیکن جب دولہا میاں اپنی بیوی کی کمر میں ہاتھ ڈالے اندر سے برآمد ہوئے تو دیکھنے والے سناٹے میں آ گئے۔ اس کرپانی وضع کے دولہا نے اپنے یار دوستوں سے بیوی کا تعارف کروایا۔ خوب زور زور سے ہاتھ ملائے گئے۔ مبارک باد دی گئی اور جو لوگ اس سعادت سے محروم رہے وہ دلھن بی کو کچھ اس طرح دیکھ رہے تھے گویا میاں علم الدین شہید کا جنازہ دیکھ رہے ہیں۔ رہا دلھن بی کا باپ! تو وہ خوشی سے پھولا نہیں سماتا تھا اور گھر میں اگر بی بی جی اپنی سعادتمند بیٹی کی اس خوش نصیبی پر پھول پھول کر کپا ہو رہی ہوں تو شاید کچھ ایسا غلط نہ ہوگا۔ اب تم بھی ذرا خدا لگتی کہو کر پہلے وقتوں کے مسلمان بھی اسی قسم کے ہوا کرتے

تھے لیکن توبہ ہے میری! تم تو یہ فتوے لگا کر میری زبان بند کردو گی کہ یہ روشنی اور ترقی کا زمانہ ہے۔ خربوزے کو دیکھ کر خربوزہ رنگ پکڑتا ہے۔ بے حیائی اور بے حمیتی کا زمانہ ہے لیکن بیٹی۔ مزا تب آئے جو پورا رنگ چڑھے۔ یہ کیا آدھا گھوڑا آدھا گدھا۔ تم کہتی ہو کہ یہ "فیشن ماں" زمانۂ حال کی ایجاد ہے اور میں کہتی ہوں کہ یہ شیطان ملعون کا سب سے بڑا کارنامہ ہے کہ اس نے شریف زادیوں کو بھی اس کے زور سے گھروں سے نکلنے پر مجبور کردیا ہے۔ رہا منھ پر سپیدا پوتنا۔ سرخی سے ہونٹ بندر کے منھ کی طرح لال کرنا۔ ٹیڑھی مانگ نکالنا بازاروں اور سڑکوں پر کسی شتر بے مہار کی طرح مارے مارے پھرنا تو بیٹی! اگر غور کرو جس طرح قوم عاد اور ثمود پر اللہ نے عذاب نازل فرمایا۔ اسی طرح ہم مسلمانوں پر بھی یہ ایک عذاب ہی ہے کہ ہم اللہ کے بنائے ہوئے چہروں کو ناپاک چیزوں سے سنوار کر اور بھی ناپاک بنا دیتی ہیں۔ لیکن سمجھنے اور سوچنے وہی ہیں جن کو اللہ نے آنکھیں دی ہیں عقل دی ہے۔ یہ تو اللہ کی دین ہے۔"

بڑی بی کے تو چابی لگ جاتی تھی۔ ایک بات ختم نہ

ہوتی تو دوسری شروع کر دیتیں۔ سکینہ بیچ میں بولی۔

"اے بڑی بی! اب چھوڑو اس قصے کو۔ کوئی اور بات بھی تو کرو۔"

بڑی بی سر ہلا کر بولیں۔

"یہ قصہ چھوڑوں کیسے؟ میں نے کوئی فرنگیوں کے یہاں تعلیم تو پائی نہیں کہ ایک بحث شروع کر کے پھر لگوں بغلیں جھانکنے۔ بیٹی! شریف لوگوں کا دستور یہی ہے کہ دوسرے کی خاموش بیٹھے سنا کریں جب وہ کہہ چکے تو پھر اس کا جواب دیں۔ اب تم نے بڑے فخر سے یہ کہہ دیا کہ لڑکیاں اب مشاعروں میں بھی شامل ہوتی ہیں۔ ہاں ٹھیک ہے! اور بیشک مسلمانوں کے لئے اس سے بڑھ کر فخر کی اور بات کیا ہو سکتی ہے کہ ان کی بہو بیٹیاں مشاعروں میں جا کر دادِ سخن لینے اور دینے لگی ہیں۔ یہی تو اصلی ترقی ہے۔ کہ قوم کی قوم لامذہبی اور بے حیائی کی رو میں بہہ جائے۔ بیٹی! جس روز ریڈیو پر مشاعرہ ہو رہا تھا میں بھی ایک جگہ بیٹھی سن رہی تھی۔ اور سچ پوچھو تو شرم سے میں تو ڈوب ڈوب جاتی تھی۔ تھا تو سردی کا ہی موسم لیکن میرے تو ندامت سے پسینے چھوٹ رہے تھے۔ اور میں دل میں

کہہ رہی تھی کہ مولا کریم ! یہ بھی تیرے رنگ ہیں کہ آج مسلمان عورتیں اس خرافات میں بھی پیش پیش نظر آنے لگی ہیں۔ اور مردوں کو دادِ سخن دے رہی ہیں۔ اور چلا چلا کر اور شاید ہاتھ بڑھا بڑھا کر کہہ رہی ہیں کہ واہ ٹہر صاحب ! واللہ خوب مصرعہ کہا۔ شاید یہ ٹہر صاحب رشتے میں ان کے ماموں جان لگتے ہوں گے جو اُن کے ایک ایک مصرعہ پر یہ یوں گھلی جاتی تھیں۔ خدا کرے وہ دن بھی کبھی ہو کہ مرد اور عورتیں ایک دوسرے کے دوش بدوش بیٹھ کر غزلیں پڑھیں اور مرد مونچھوں پر تاؤ دے دے کر عورتوں کو دادِ سخن دیں اور عورتیں آنکھیں مٹکا مٹکا کر اور گورے گورے ہاتھ بڑھا بڑھا کر مردوں کو خراجِ تحسین پیش کریں۔ اور میں نے تو یہ بھی سنا کہ بعض شرم و حیا سے عاری باپ جن کا دین اور مذہب صرف پیسہ ہے اپنی صاحبزادیوں کو بھی ساتھ لے کر وہاں موجود تھے اور باپ کے دوش بدوش یہ صاحبزادیاں بھی اپنے اشعار سناتی تھیں اور ہمارے غیر مذہب کے بھائی ایک دوسرے کی طرف دیکھ دیکھ کر اور مسکرا مسکرا کر کہہ رہے تھے کہ لو دیکھ لو سیکھ لی مسلمانوں نے فلاح کی راہ ! اور شاید قسمت یہ کہہ رہی ہو کہ اب قوم کی قوم

ہو گی تباہ !! ہمارے جناح خدا انہیں نوح ؑ کی عمر دے اگر پاکستان بنالیں تو میں تو ان کی خدمت میں حاضر ہو کر یہ عرض کروں گی کہ ایسے بے حیا مسلمانوں کی ایک علیحدہ بستی بنا دیں۔"

سکینہ نے پوچھا۔

"تو گویا عورت کے لئے شعر کہنا بھی حرام ہوا؟"

"کون کہتا ہے؟" بڑی بی بولیں۔ "میں نے تو کہا نہیں۔ خدا نے علم دیا ہے تو ایک شعر چھوڑ ہزار شعر کہو۔ لیکن اب مُنہ نہ کھلواؤ سکینہ! ہماری بعض شعر کہنے والیاں عشق و محبت کے مضمون تو مردوں سے بھی سوا باندھنے لگی ہیں۔ وہی فراق! وہی جدائی! وہی حُسنِ یار! اور وہی وصالِ محبوب! وہی ہائے توبہ۔ اور وہی میں مری بھائی۔ تو آ جلدی! اچھی! اچھی! کیا اس ہائے ہُو کے سوا دنیا میں اور کوئی مضمون ہی نہیں رہا سکینہ! سچ تو یہ ہے کہ تم جسے ترقی اور روشنی کہتی ہو اگر تم گریبان میں منہ ڈال کر دیکھو تو یہی ترقی اور روشنی ہم مسلمانوں کے لئے تباہی کا پیغام ہے۔ اور خدا کی قسم! مجھے تو اپنی قوم کی بے حمیتی پر اب رونا بھی نہیں آتا۔ اور آئے بھی تو کیسے۔ میرے آنسو ایسے ارزاں نہیں کہ کسی بے حمیت کی تباہی پر نکل پڑیں۔ بیٹی!

یہ ترقی اور روشنی تم لوگوں کو مبارک ہو۔ ہماری تو وہ بات ہے کہ بخشو بی بلّی! چوہا لنڈورا ہی بھلا!! خدا جانے ہم لوگوں کا انجام کیا ہوگا۔ الٰہی تو بہ! عید بقرعید تو سال میں ایک بار آتی ہے لیکن اس مبارک دن بھی ہم مسلمانوں کے گھروں میں اُلّو بولتا نظر آتا ہے۔ میاں تو کسی ہوٹل میں عید منانے چلے جاتے ہیں اور بی بی جی عید پارٹی کی رونق بڑھانے کسی عید پارٹی میں تشریف لے جاتی ہیں۔ اب تم ہی خدا لگتی کہنا بیٹی سکینہ! کوئی بات ہے بھی ہم میں مسلمانوں کی سی۔ ہماری تو وہی بات ہے کہ: پڑھے نہ لکھے اور نام محمد فاضل!"

بڑی بی کا لکچر تو شاید ابھی ختم نہ ہوتا۔ لیکن پڑوس کی دو ایک عورتیں جن کے ساتھ سکینہ کو سینما جانا تھا آ گئیں۔ بڑی بی نے جوان کا بناؤ سنگار دیکھا تو جھٹ انا للہ وانا علیہ راجعون پڑھنے لگیں۔ سکینہ نے ہنس کر کہا۔

"بڑی بی! آؤ نا تم بھی۔ ذرا سینما دکھلائیں تمہیں۔"

بڑی بی زمین پہ تھوک کر بولیں۔

"جاؤ بیٹی جاؤ! لیکن میری بات یاد رکھنا۔ واپس آ کر

غسل بھی کر لیجیو اور کپڑے بھی بدل لیجیو!"

"اور سات نفل بھی پڑھنا!" پاس سے ایک نے مسکرا کر کہا۔ "ٹھیک ہے نا بڑی بی؟"

یہ سن کر سب نے قہقہہ لگایا اور بڑی بی بڑبڑاتی ہوئی اُٹھ کر چلی گئیں۔

بڑی بی

"بڑی بی! توبہ ہے! تم تو پنجے جھاڑ کر پیچھے پڑ جاتی ہو" نگینہ تنک کر بولی "کوئی گھنٹہ بھر سے اٹھو نماز پڑھو، اٹھو نماز پڑھو! کی رٹ تم نے لگا رکھی ہے۔ جیسے مجھے اور کوئی کام ہی نہیں۔ یہ دقیانوسی باتیں تمہارے دماغ میں کچھ ایسی گھسی ہیں کہ بس توبہ ہی بھلی"

اتنا کہہ کر نگینہ پھر کتاب پڑھنے لگی

بڑی بی بولیں۔

"بچی! ہوش کر! کیا فرنگیوں کے اسکول میں بس لا مذہبی کی تعلیم ہی دی جاتی ہے۔ جیسے دیکھو نماز کے نام سے ایسی

چمکتی ہے جیسے ارنا بھینسا سرخ رنگ کے کپڑے سے۔ بس شوق ہے تمہیں تو بال سنوارنے کا یا فرنگنوں ایسی ٹیڑھی مانگ نکالنے کا۔ توبہ ہے میری تو! اللہ میاں کے بنائے ہوئے خوبصورت چہرے کو جانے کیا کیا ناپاک دوائیں مل مل کر چمکایا جاتا ہے۔ سوسو بار دن بھر میں آئینہ پر نگاہ پڑتی ہے۔ نصف آستین کی کرتی اور کھلا گریبان اور پون گز کا دوپٹہ شانوں پر لعنت ہے اس لباس پر۔ پھر اس پر ٹپ ٹپ کرنے والی اونچی ایڑی کی گرگابی۔ اللہ رے تیری شان! کیا مسلمان لڑکیاں ایسی ہی ہوا کرتی ہیں۔ تم سے تو کرسٹان ہی بہتر ہیں۔ کچھ نام کی لاج تو ہے انہیں۔"

"ہم مسلمان نہیں تو پھر اور کیا ہیں" نگینہ نے کتاب بند کر کے کہا "بڑی بی! تم تو مسلمان اسے کہو جس کے گنواروں ایسے ڈھیلے ڈھیلے کپڑے ہوں اٹھتی بیٹھتی یا اللہ! بسم اللہ بات بات پر سبحان اللہ! ماشاء اللہ کہے۔ بھیگی بلی کی طرح کونے میں دبکی بیٹھی رہے۔ مرد تو رہے ایک طرف۔ سورج چاند۔ ستارے سبھی سے پردہ کرے۔ صبح منہ اندھیرے اٹھے۔ نماز پڑھے۔ پھر قرآن لے بیٹھے اور سر ہلا ہلا کر طوطے

کی طرح رٹے جائے۔ پھر جھاڑو پکڑ کر گھر کی صفائی کرے۔ پھر چولھے کے پاس بیٹھ کر کسی ماما کی طرح کام میں لگ جائے جب مرد کھا چکیں تو کسی کونے میں دبک کر بھاروں کی طرح ہو لے ہو لے آپ بھی کچھ کھا پی لے۔ دوپہر ہوئی تو پھر وہی نماز کا دھندا اور جو سینا پرونا جانتی ہو تو گھر بھر کے پھٹے پرانے کپڑے رفو کرنے بیٹھ جائے، گھنٹہ دو گھنٹہ کی دیدہ ریزی کے بعد پھر وہی نماز۔ اور پھر چولھے پر قربان ہو۔ ادھر شام ہوا دھر پھر نماز آ دھمکے۔ پھر وہی کھانا پکانا، مردوں کے بستر کرنے۔ اور سونے سے پیشتر پھر نماز۔ لو جی! یہ رہی مسلمانی! بڑی بی! دنیا میں آرام سے رہنے کے یہ پچھن نہیں ہوا کرتے تم کیا جانو تہذیب کس جانور کا نام ہے۔ اور تعلیم کیا بلا ہوتی ہے۔ ایک زمانہ بدل گیا لیکن تم نہ بدلیں۔ لو! اب مت بولنا مجھے یہ ناول ختم کر لینے دو۔"

بڑی بی پرانے خیالات کی عورت تھیں چپکی بیٹھی نگینہ کی باتیں سنتی رہیں۔ لیکن ناول کا نام سن کر تعجب سے بولی۔

"یہ ناول کیا ہوتا ہے؟ کیوں نگینہ! کوئی میلاد نامہ ہے

یا نور نامہ" کی طرز کی کوئی کتاب ہوگی۔ توبہ ہے فرنگی نے بھی دنیا بھر کا علم کتابوں میں ٹھونس دیا ہے۔

ایک یہی ہماری مذہبی کتابیں رہ گئی تھیں۔ سو دیکھ لو انہیں بھی اپنے رنگ میں رنگ ڈالا۔ ایسی ہی باتوں سے تو ہمارے ملک میں یہ بے دینی کا مرض عام ہو رہا ہے ٹھیک ہے نا نگینہ، کچھ غلط تو نہیں کہا میں نے"

نگینہ نے ہنس کر ایک قہقہہ لگایا۔ بڑی بی ذرا غصے سے بولیں۔

"اس میں ہنسنے کی کیا بات تھی بھلا تم تو ادب داب سے بھی کوری ہو رہی ہو"

"اے بڑی بی!" نگینہ نے کہا "چہ داند بوزنہ لذات ادرک! یہ ناول ہے نا ول یہ نہ تو تمہارا میلاد نامہ ہے اور نہ ہی نور نامہ! بنتی تو بڑی عقلمند ہو۔ لیکن ذرا سوچو تو سہی کہ یہ بھلا ممکن بھی ہو سکتا ہے کہ انسان جیتے جی آسمانوں پر چلا جائے پھر اللہ میاں سے باتیں بھی کرے۔ بس اسی برتے پہ ایمان ایمان پکار رہی ہو۔ بڑی بی! یہ ڈھکوسلے اب پرانے ہو چکے۔ چھوڑو ان باتوں کو"

"توبہ کر نگینہ توبہ!" کیوں کفران تولتی ہے۔" بڑی بی نے دونوں ہاتھوں سے اپنے کان پکڑتے ہوئے کہا "وہ بات زبان سے مت نکال جس کے کہنے سے انسان کافر ہو جائے قربان جاؤں اپنے دلارے نبی جی صلعم پر وہ برحق آسمانوں پر گئے۔ نبیوں سے ملاقات کی۔ فرشتوں سے ملے اور اللہ میاں کا قرب حاصل ہوا"

"اے خدا کے لئے ذرا چپ تو کر" نگینہ نے تنگ آ کر کہا۔ "بس پانچ دس صفحے ہی باقی ہیں۔ پھر ناول ختم ہو جائے گا۔"

"پہر بھر سے ناول ناول سن رہی ہوں۔" بڑی بی نے کہا "لیکن یہ معلوم نہ ہوا کہ یہ ہے کیا بلا۔"

"بڑی بی!" نگینہ نے ہنس کر کہا "بڑے مزے کی کتاب ہے ایک عورت اور ایک مرد کی محبت کا قصہ ہے۔"

یہ سن کر بڑی بی ذرا تعجب سے نگینہ کی طرف دیکھنے لگیں پھر سر ہلا کر بولیں۔

"بس سمجھ گئی! بڑی بے حیائی کی کتاب ہے کوئی۔ لوجی! یہ لے غیرتی کی کتابیں اب شریفوں کے گھروں میں بھی گھس آئیں اے بیٹی! خدا کا خوف کر۔ رسول کا خوف کر۔ خاندان

کی عزّت کا خیال کر۔ ڈال چولھے میں اس شیطانی کتاب کو کنواری لڑکی اور "عشق و محبت" کی کہانیاں۔ توبہ ہے پاک ذات توبہ! اٹھ لڑکی! چھوڑ یہ مردود کہانی۔ وضو کر اور اللہ محمدؐ کا نام لے۔ کسی پیر اولیا کا ذکر کر تاکہ تیری عاقبت بھی سدھرے اور........"

"ہائے توبہ!" نگینہ نے جھلا کر کہا" یہ بلا کیا پڑ گئی میرے پیچھے۔ اب میں تمہاری طرح بڈھی کھوسٹ تو ہوں نہیں کہ ہر وقت مصلّے پر ناک رگڑا کروں تم جو عمر بھر اللہ محمدؐ کا نام لیتی رہیں تو کیا ملا تمہیں۔ توبہ ہے۔ تم تو گلے کا ہار ہی ہو گئیں اس سے تو بہتر تھا جو میں سکول سے آتی ہی نہ۔ گھر کاہے کو ہوا کوئی خانقاہ ہو گئی۔ جہاں ہر وقت ہُو حق کا شور مچا کرے کیا کم بختی ہے آرام سے پڑھنا بھی نہیں ملتا۔ یہ کہکر نگینہ اٹھ کر دوسرے کمرے میں چلی گئی۔

نگینہ ایک امیر گھرانے کی بیٹی تھی۔ باپ کی سرکار میں بہت عزّت تھی امیرانہ ٹھاٹھ سے رہتا۔ نگینہ مدرسہ میں پڑھتی تھی۔ آج کل سکول بند تھا۔ اس کی عادت تھی کہ دیر سے سونا دیر سے اٹھنا۔ پھر کوئی گھنٹہ بھر بناؤ سنگار میں صرف ہو جاتا۔ اتنے

میں دو ایک اخبار آجاتے۔ کچھ دیر ان کا مطالعہ کرتی۔ پھر امتحان کی تیاری میں کچھ وقت صرف ہوتا۔ دن ڈھلا تو پھر وہی بناؤ سنگار۔ کبھی سینما اور کبھی ہوا خوری بس یوں ہی دن بسر ہو جاتا۔

بڑی بی جس کی گود میں کھیل کر نگینہ پروان چڑھی تھی پرانے خیال کی عورت تھیں۔ نماز روزے کی پابند بہر رات رہے اُٹھتیں اور دن چڑھے تک عبادت میں مشغول رہتیں۔ گھر کے سب لوگ اُن کی عزت اور احترام کرتے لیکن نگینہ کے یہ چھچھن بڑی بی کو ایک آنکھ نہ بھاتے۔ نگینہ کو بڑی بی سے محبت بھی تھی اور اُن کا ادب بھی کرتی لیکن چونکہ ذرا شوخ مزاج تھی اس لئے گاہے گاہے چمک بھی اٹھتی۔ اسے غصے میں دیکھ کر بڑی بی صرف ہنس دیتیں۔

نگینہ جس ماحول میں تعلیم اور تربیت پا رہی تھی سراسر مغربی تھا اس لئے اس کے دل میں مذہب کا کچھ ایسا احترام نہ تھا ادہر بڑی بی تھیں جو ہر وقت اسے پیار و محبت سے نماز پڑھنے اور مسلمانوں کی طرح رہنے سہنے کی تلقین بھی کیا کرتیں اور تاکید بھی۔

ایک روز نگینہ نے اپنی چند ایک سہیلیوں کو چائے پر مدعو کیا۔ چائے بہت پُر تکلف تھی۔ دس پانچ دیسی مٹھائیاں تھیں۔ مختلف قسم کے کیک تھے، پیسٹری تھی۔ موسم کے دو چار پھل تھے۔ دو چار لڑکیاں تو پوری مغربی طرز کے لباس میں ملبوس تھیں۔ لیکن زہرہ اور زبیدہ کا لباس خالص ہندوستانی تھا۔ زہرہ اور زبیدہ بھی امیر گھرانے کی بیٹیاں تھیں۔ لیکن ان کی ہر بات میں متانت اور سنجیدگی تھی۔ تہذیب تھی۔ بات چیت کا انداز۔ اٹھنا بیٹھنا سب میں ایک وقار تھا۔ لڑکیاں بیٹھی خوش گپیاں کر رہی تھیں۔ گراموفون بج رہا تھا۔ کہ اتنے میں بڑی بی آگئیں۔ دو ایک ریکارڈ تو انہوں نے چپکے بیٹھے سنے۔ پھر کہنے لگیں۔

"لڑکیو! کیا بیہودہ گیت سن رہی ہو۔ کوئی اللہ محمدؐ کی نعت ہو تو سناؤ لطف بھی آئے اور ثواب بھی ملے"

نگینہ نے ایک ریکارڈ "نام محمدؐ پہ مر جائیں گے" لگا دیا ادھر ریکارڈ بجنا شروع ہوا ادھر بڑی بی نے جھوم جھوم کر درود شریف پڑھنا شروع کر دیا۔ لڑکیاں کھل کھلا کر ہنسنے لگیں اور بڑی بی ناراض ہو کر پاس سے اٹھ کر چلی گئیں۔

جب چائے ہو چکی تو نگینہ نے اپنے مہمانوں کو برآمدے میں بٹھا کر ان کی تصویر اتاری۔ بڑی بی ایک طرف کھڑی دیکھ رہی تھی۔ ایک لڑکی بولی۔

"آپ بھی تشریف لے آئیں"

بڑی بی نے وہیں سے جواب دیا۔

"اے توبہ کرو بچی! یہ تو بت پرستی ہے"

جب تصویر کھینچی جا چکی تو بڑی بی نے ساتھ کے کمرے میں کھڑے ہو کر عصر کی اذان دے دی۔ اس پر لڑکیوں نے پھر ایک قہقہہ لگایا۔ لیکن زبیدہ اور زہرہ کو یہ سخت ناگوار ہوا یہ دونوں جلدی سے وضو کر کے بڑی بی کے پاس جا کھڑی ہوئیں۔

بڑی بی دو چار منٹ تو دوسری لڑکیوں کی راہ دیکھتی رہیں لیکن جب اور کوئی نہ آئی تو خود ان کے پاس جا کر

"آؤ بھئی! ذرا نماز تو پڑھ لو"

لیکن لڑکیاں ٹس سے مس نہ ہوئیں اور بڑی بی بڑبڑاتی ہوئی واپس آ گئیں اور زبیدہ اور زہرہ کے ساتھ نماز پڑھنے میں مشغول ہو گئیں۔

جب نماز ہو چکی تو زبیدہ اور زہرہ بھی دوسری لڑکیوں کے پاس آ بیٹھیں۔ ایک لڑکی نے زبیدہ سے ہنس کر کہا۔

"بہن! ہمارے لئے بھی تو دعا مانگی ہوتی۔"

"مانگی تو تھی!" زبیدہ نے جواب دیا۔

"کیا؟" اس لڑکی نے پوچھا۔

"یہی کہ خدا تمہیں بھی نماز پڑھنے کی توفیق دے" زبیدہ نے مسکرا کر جواب دیا۔

"اور اپنے لئے؟" اسی نے پھر پوچھا۔

"ہاں!" زبیدہ بولی "اپنے لئے کیوں نہیں۔"

"کیا مانگا تھا اپنے لئے" ایک اور لڑکی نے پوچھا۔

"ایمان اور صحت!" زبیدہ نے جواب دیا۔

"بس ایمان اور صحت ہی" اسی لڑکی نے کہا۔

"تو اور کیا" پہلی بولی "تم چاہتی ہو کہ اللہ میاں سے کہتیں کہ دولھا ملے تو وہ بھی کسی مسجد کے مُلّا کی طرح پکّا نمازی ہی ہو۔"

"سچ کہتی ہو!" زبیدہ نے ہنس کر کہا "تمہیں تو کوئی کرسٹان ہی پسند ہو گا۔ مسلمان کہلانے کو نام ہی کافی ہے۔ خدا نہ کرے کہ شکل و صورت اور عمل سے بھی کوئی مسلمان جانے۔"

"لو جی!" پہلی نے ہنس کر کہا "مل گیا فتوے۔ ہم تو مسلمان ہی نہ ہوئے۔ چلو یہ قصہ بھی ختم ہوا"

اور دوسری نے ذرا طنزاً کہا۔

"ہاں بہن! مسلمان تو بس وہ ہے جو پانچوں وقت ماتھا رگڑا کرے۔"

"اور آتے ہی اسلام علیکم اس زور سے کہے کہ مردے بھی جاگ اٹھیں" پہلی لڑکی نے کہا۔

لڑکیوں میں یہ باتیں ہو ہی رہی تھیں کہ بڑی بی بھی پاس آ بیٹھیں اور ذرا سنجیدگی سے کہنے لگیں۔

"بٹیا!" مذہب کا مذاق اڑانا تو سخت گناہ ہے"

"بڑی بی!" پہلی لڑکی بولی "کون مذہب کا مذاق اڑا رہا ہے ہاں! بہن زبیدہ سے ہمیں ایک دو باتوں میں اختلاف ضرور ہے"

"سنو! سنو!" بڑی بی کہنے لگیں "جس نے مذہب میں اختلاف کیا وہ ملحد بھی ہے اور کافر بھی" لڑکیو! قبر کے عذاب سے ڈرو اور دوزخ کی آگ سے خوف کھاؤ۔ تم کیا جانو! بہت خوفناک چیزیں ہیں دونوں۔ میرے تو ان کے خیال ہی سے رونگٹے کھڑے ہونے لگتے ہیں۔"

ایک لڑکی ذرا مسکرا کر بولی۔

"سچ ہی تو کہتی ہیں! آنکھوں دیکھی چیزیں جو ہوئیں۔ جب پہ گذری ہو وہی کچھ جانے"

لیکن زہرہ اس منھ پھٹ لڑکی کی طرف دیکھ کر کہنے لگی۔

"اختلاف رائے تو واقعی کچھ بری بات نہیں۔ لیکن اسلام کے احکام اور اصول تو ایسے صاف ہیں کہ یہاں اعتراض اور اختلاف کی تو گنجائش ہی نہیں۔ ہاں! کٹ حجتی اور بات ہے"

نگینہ کہنے لگی۔

"بہن زہرہ معاف کرنا! لیکن یہ فلسفہ بھی تو نرالا ہی ہے کہ ہر بات بلا حجت اور بلا دلیل تسلیم کر لی جائے۔ دور کیوں جاؤ تم ذرا اپنے ان علمائے دین کو ہی دیکھ لو نا۔ ایک ایک مسئلہ پر جو اختلاف ان لوگوں نے پیدا کر رکھا ہے۔ شاید ہی کسی اور فرقے میں نظر آئے۔ ان کے انہی اختلافات نے تو ہم لوگوں کو مذہب سے دور کر رکھا ہے"

زہرہ "آپ نے ٹھیک فرمایا۔ لیکن اسلام تو عین فطرت کے مطابق ہے۔ اس کے اصولوں میں نہ کوئی پیچ نہ کوئی الجھن کھلے کھلے اور صاف احکام ہیں۔ جسے ہر طبع سلیم فوراً قبول کر لیتی

ہے" اور جو قیود اور پابندیاں ہیں" پاس سے ایک بولی "ان کا بھی تو کچھ کہو۔"

"استغفر اللہ!" زہرہ بولی "کیسی قیود اور کہاں کی پابندیاں کس نے کہا آپ سے؟"

"دو چار ہوں تو گنواؤں بھی" اس نے جواب دیا۔

یہ سن کر نگینہ کہنے لگی۔

"لو مجھ سے سنو! پانچ وقت کی اٹھک بیٹھک تیس دن کا فاقہ۔ حج اور زکوٰۃ۔ اب تم ہی کہو کہ کیا یہ باتیں فطرت کے مطابق ہیں۔"

پاس سے ایک اور بولی۔

"ہمیشہ سارنگی کی طرح غلاف میں بند رہنے کا حکم بھی شاید فطرت ہی کے مطابق ہو گا۔"

بڑی بی جھلا کر بولیں۔

"لڑکیو! تمہارے منہ میں تو گز بھر کی زبان ہے۔ پڑھو اکیس بار استغفار۔ نماز کو اٹھک بیٹھک کہہ دیا اور روزوں کو فاقہ کا نام دے دیا۔ توبہ ہے مری تو ......"

"بڑی بی!" زہرہ بات کاٹ کر کہنے لگی "ذرا ٹھہرو تم" پھر

نگینہ سے۔

"ہاں نگینہ! کچھ اور بھی؟"

"لو سنو!" نگینہ نے جواب دیا" بال مت کٹواؤ۔ ٹیڑھی مانگ مت نکالو۔ ساری اور جمپر مت پہنو۔ بناؤ سنگار مت کرو۔ پوڈر مت لگاؤ۔ کلب میں مت جاؤ۔ پارٹیوں میں مت شامل ہو۔

زہرہ:" کچھ اور بھی"

نگینہ:" بہن" ع

"رگ رگ میں نیش غم ہے کہئے کہاں کہاں کی!"

زہرہ ہنس کر بولی۔

"نگینہ افسوس! معلوم ہوتا ہے تمہیں اپنے مذہب کی ذرّہ بھر بھی خبر نہیں"

"خبر کیوں نہیں!" نگینہ نے چمک کر جواب دیا" مجھے بھی تو ذرا بتلاؤ۔ عورت کو بناؤ سنگار سے کون منع کرتا ہے۔ اور"

"ٹھہرو زہرہ!" بڑی بی بات کاٹ کر کہنے لگیں۔ لڑکیو! افسوس تم واقعی اسلام سے بالکل کوری ہو۔ کاش تم نے خاتونِ جنّت کی زندگی کا مطالعہ کیا ہوتا۔ آپ کے پیارے اور نازک

ہاتھوں میں چکّی پیستے پیستے چھالے پڑ جاتے تھے۔ مشکیزہ اٹھا اٹھا کر شانوں پر بدھیاں پڑ گئی تھیں۔"

"اسے رہنے دو بڑی بی!" ایک بولی "اتنا بڑا پیغمبرؐ اور بیٹی کا یہ حال۔ بس اسی سے سمجھ لو کہ اسلام کے احکام کتنے سخت ہیں۔ ایک پیغمبر زادی کو کیا پڑی کہ وہ چکّی پیسے اور مشکیزہ اٹھائے ایک طرف تو یہ بتلایا جاتا ہے کہ پیغمبر اسلام ایک دنیا کے بادشاہ تھے اور دوسری طرف بیٹی کے گھر کی یہ حالت کہ توبہ ہی بھلی!"

زہرہ کو اس لڑکی کی یہ بات، بہت ناگوار گذری۔ کہنے لگی "افسوس! تم میں اتنی صلاحیت بھی نہیں کہ اس مبارک اور مقدّس بزرگ ہستی کا نام بھی ادب سے لو جس کا تم اور ہم سب کلمہ پڑھتے ہیں۔ تم جسے ایک دنیا کا بادشاہ کہتی ہو۔ وہ حقیقت میں دونوں جہان کے سردار تھے۔ ہاں میری تمہاری طرح دنیا کے بندے نہیں تھے۔ حضرت فاطمہ رضی اللہ تعالیٰ سے جو حضورؐ کو محبت تھی ایک دنیا پر آشکارا ہے لیکن بہن! جہاں امّتؐ کا سوال ہوتا وہاں بیٹی کی تکلیف کی بھی پرواہ نہ ہوتی۔ اور یہی اصلی اسلام ہے۔ اور اسلام کی تعلیم بھی کاش

تم نے کبھی قرآن کا مطالعہ ہی کیا ہوتا۔ پھر تمہیں نبی صلعم کی شان اور اسلام کی عظمت کا اندازہ بھی ہوتا۔

یہ سن کر نگینہ بولی۔

قرآن کوئی کیا پڑھے۔ کچھ پلے تو پڑتا نہیں"

"خدا توفیق دے تو عربی پڑھو" زہرہ نے جواب دیا" اور نہیں تو ترجمہ ہی غور سے پڑھ لیا کرو"۔

"خیر!" پہلی لڑکی کہنے لگی" قرآن بھی پڑھ لیں گے۔ مزا تو تب تھا جو ہمارے اعتراضات کا جواب بھی کچھ دیا ہوتا"۔

زہرہ "سنئے! قرآن مجید میں یہ کہیں مذکور نہیں کہ عورت بناؤ سنگار نہ کرے۔ ساری نہ باندھے ٹیڑھی مانگ نہ نکالے ہاں یہ حکم ضرور ہے کہ پانچوں وقت کی نماز پڑھا کرے۔ پھر اس میں آسانیاں مہیا کر دی گئی ہیں۔ سفر ہو تو قضا کر کے پڑھ لو۔ بیمار ہو تو بیٹھ کر یا اشارے سے نماز ادا کر لو۔ اسی طرح ماہِ رمضان کے تیس روزے رکھنے کا حکم ہے۔ اور یہاں پھر مسافر ہو یا بیمار یا کوئی مجبوری ہو سب کے لئے آسانیاں موجود ہیں۔ اسی طرح حج بھی ہے۔ اگر گھر میں آسودگی ہے اور کوئی خاص فکر نہ ہو تو حج کر و۔ دولت ہے تو زکوٰۃ دو"۔

"لیکن!" نگینہ کہنے لگی "یہ کہاں لکھا ہے کہ برقعہ اوڑھ کر بھوت بنی پھرو"

"ہاں لکھا ہے" زہرہ نے جواب دیا "عورت کو پردہ کرنے کا حکم دیا گیا ہے۔ اور زینت کے مقام چھپانے کی ہدایت کی گئی ہے۔ اور ایک جگہ ان تمام رشتہ داروں کا ذکر کر دیا گیا ہے جن سے عورت کو پردہ کرنا لازمی ہے"

"لیکن منہ چھپانے کا تو کہیں حکم نہیں" ایک لڑکی نے کہا۔

"خاص طور پر نہیں" زہرہ نے جواب دیا "لیکن زینت کے مقام چھپانے کا حکم تو ہے۔ اب تم ہی کہو کہ عورت کی زینت کے مقام کیا کیا ہیں"

"مجھ سے سنو!" نگینہ بولی "چہرہ۔ پیشانی۔ ناک۔ آنکھ۔ سینہ پنڈلیاں۔ ٹھیک ہے نا"

"بالکل ٹھیک" زہرہ نے کہا "اور بحث بھی ختم"

"بحث کیسے ختم ہوئی؟" نگینہ نے پوچھا۔

"عرض کئے دیتی ہوں" زہرہ بولی "خدا کا حکم ہے کہ عورت زینت کے مقام چھپائے۔ تم کہتی ہو کہ چہرہ۔ پیشانی۔ ناک۔ آنکھ سینہ اور پنڈلیاں زینت کے مقام ہیں۔ تو بس انہیں غیر محرموں

سے چھپا کر رکھو۔ لیکن غضب تو یہ ہے کہ آج کل فیشن کی دل دادہ جو ہیں وہ انہیں چیزوں کی نمائش پر مری جا رہی ہیں ذرا دل میں سوچو تو سہی کہ ایک غیور اور باحیا عورت کس طرح یہ گوارا کر سکتی ہے کہ غیر اس کا منھ دیکھ لے۔ یا وہ غیروں سے مِل جُل کر رہے۔ میرے خیال میں اس دور کی سب سے بڑی لعنت یہی ہے کہ ایک مسلمان عورت کے دل میں نہ حمیت ہے نہ غیرت۔"

"لیکن مغرب کی تقلید کرنا کچھ گناہ تو نہیں ہے" ایک اور نے پوچھا۔ "مغربی طرز کا لباس پہننے میں کیا گناہ ہے"

"کون کہتا ہے" زہرہ بولی۔ "کہ مغرب کی تقلید کرنا یا مغربی طرز کا لباس پہننا گناہ ہے۔ سوال تو صرف یہ ہے کہ آیا ہم مغرب کی تقلید کریں یا اسلام کے احکام پر چلیں۔ اگر مغرب کی تقلید کرنے سے خدا اور رسول صلعم ناراض ہوتے ہیں تو بھاڑ میں جائے ایسی تقلید"

"لیکن بہن!" ایک اور نے کہا۔ "اتنا تو تم بھی مانو گی کہ ہمارے یہاں جو پردہ ہے بہت تکلیف دہ چیز ہے"

"ٹھیک ہے!" زہرہ نے جواب دیا۔ "اسلامی ممالک میں

اس قسم کا پردہ نہیں۔ لیکن ہمارے یہاں ہندوستان میں اس قسم کے پردے کی ضرورت ہے۔ جس ملک میں دس گیارہ کروڑ مسلمان ہوں اور بیس اکیس کروڑ کے لگ بھگ دوسری قومیں آباد ہوں۔ تم ہی کہو کہ پھر مسلمان کیا کریں۔ ہاں! اگر مسلمان اپنی تنظیم کریں تو شاید پھر اس مشکل کا بھی سدِّباب ہو جائے۔ لیکن افسوس! ہم لوگوں کو فرقہ بندیوں نے تباہ کر ڈالا ہے۔ حضرت اقبالؔ نے کیا خوب کہا ہے کہ؂

منفعت ایک ہے اس قوم کی نقصان بھی ایک
ایک ہی سب کا نبیؐ دین بھی ایمان بھی ایک
حرمِ پاک بھی اللہ بھی قرآن بھی ایک
کچھ بڑی بات تھی ہوتے جو مسلمان بھی ایک
فرقہ بندی ہے کہیں اور کہیں ذاتیں ہیں
کیا زمانے میں پنپنے کی یہی باتیں ہیں

اور پھر کس قدر حسرتناک لہجہ میں فرماتے ہیں کہ؂

شور ہے ہو گئے دنیا سے مسلماں نابود
ہم یہ کہتے ہیں کہ تھے بھی کہیں مسلم موجود؟

وضع میں تم ہو نصاریٰ تو تمدّن میں ہنود
یہ مسلماں ہیں جنہیں دیکھ کے شرمائیں یہود
یوں تو سیّد بھی ہو مرزا بھی ہو افغان بھی ہو
تم سبھی کچھ ہو بتاؤ تو مسلمان بھی ہو!

"ہاں!" وہی لڑکی جو ذرا زیادہ اعتراض کرتی تھی کہنے لگی۔ "یہ تو سچ ہے کہ فرقہ بندی نے ہم لوگوں کو یہاں بھی ذلیل کر رکھا ہے۔"

"یہ اختلافات تو آج مٹ جائیں" زہرہ بولی۔ "اگر ہم مسلمان بن جائیں۔ اور میں اتنا اور عرض کروں گی کہ اب ان باتوں کا زیادہ دار و مدار عورتوں پر ہے۔ اگر عورت کے دل میں خدا اور اس کے محبوب رسول صلعم کی محبت ہے تو وہ بچوں کو بھی یہی تعلیم دے گی۔ بچپنے میں جو بات دل میں جم جائے اس کا اثر بھی دیرپا ہی ہوتا ہے۔"

ایک لڑکی بولی

"لیکن یہ پانچ وقت کی نماز کا بہت بڑا حکم ہے۔ ممکن ہے شروع شروع میں اس کی ایسی ہی ضرورت ہو۔

آپ جانئے! بار بار وضو کرنے سے کیا کپڑے خراب نہ ہوں گے؟"

یہ سن کر بڑی بی جواب تک چپکی بیٹھی تھیں بولیں۔

"ڈال چولھے میں ایسے لباس کو۔ جو نماز سے روکے لباس کے خراب ہونے کا اندیشہ تو ہونے لگا۔ لیکن اس کی مار کا بھی کچھ خوف ہے جس کے ہاتھ میں زندگی اور موت ہے"

"بہن! زہرہ کہنے لگی" مجھ سے سنو! یہ نماز بھی تو ایک طرح کی تنظیم ہے۔ نماز سے انسان کی عاقبت سنورتی ہے برے کاموں سے برے ارادوں سے اور برے خیالوں سے روکتی ہے۔ دل میں خدا کا خوف پیدا کرتی ہے، صفائی کا خیال خود بخود پیدا ہونے لگتا ہے پھر قطع نظر ان باتوں کے تم یہ جانو کہ خدا کا حکم ہے اور حضور پیغمبر اسلام صلعم نے اس کی بار بار تاکید فرمائی ہے۔ بس یہاں سب حجت ختم ہے"

نگینہ" اور مضمون نویسی کے متعلق تمہارا کیا خیال ہے کیا مذہب اس سے بھی روکتا ہے"

"کون کہتا ہے" زہرہ بولی" کہ مذہب لکھنے پڑھنے سے

منع کرتا ہے۔ ارشادِ رسول صلعم تو یہ ہے کہ علم حاصل کرنے کے لئے اگر تمہیں چین کا سفر بھی کرنا پڑے تو گریز مت کرو۔"

"لیکن تم تو ناول پڑھتی ہو۔" بڑی بی بولیں۔ "توبہ ہے میری! کنواری لڑکی اور مرد اور عورت کے عشق کی باتیں پڑھے۔ توبہ ہے۔ پڑھنا ہے تو قرآن پڑھا کرو۔ حدیث پڑھا کرو۔ حضور نبی کریم صلعم کے حالات پڑھا کرو۔ نہ یہ کہ ایسی کتابیں لے بیٹھو جن سے اخلاق بھی بگڑے اور عاقبت بھی خراب ہو۔"

"اے بڑی بی!" نگینہ نے جھلا کر کہا۔ "خدا کے لئے چپ بھی رہو تم" پھر زہرہ سے "ہاں بہن! میری بات کا جواب دو نا تم۔"

زہرہ بولی

"بڑی بی نے کچھ غلط نہیں کہا......"

"ہزار شاباش تیری جننے والی پر" بڑی بی خوش ہو کر بولیں۔ لڑکیاں ہنسنے لگیں۔

"تو ہاں میں کہہ رہی تھی" زہرہ کہنے لگی "کہ ہم شریف زادیوں کو فضول اور لغو کتابوں سے گریز ہی کرنا چاہئے۔ رہا مضمون نویسی کا شوق تو یہ کوئی عیب نہیں۔ ہاں یہ نہ ہو کہ

شوقِ تحریر مضامین میں گھلی جاتی ہے
رہ کے پردے میں بھی بے پردہ ہوئی جاتی ہے

خدا کی قسم! مجھے ان لکھنے والیوں پر بہت افسوس ہوتا ہے جن کی نظم و نثر عشق و الفت کی صرف ایک راگنی ہوتی ہے۔

"لیکن اگر مضمون دلچسپ نہ ہوا تو پڑھے گا کون؟" نگینہ بولی۔

"اس کا مطلب تو یہ ہوا کہ عشق و محبت کی باتوں کے سوا اور کوئی چیز دلچسپ ہو ہی نہیں سکتی" زہرہ نے جواب دیا۔ "اسلامی واقعات لکھو۔ پند و نصیحت کی کہانیاں لکھو۔ کام کی باتیں لکھو۔ حفظِ صحت کے متعلق لکھو۔ امورِ خانہ داری کے متعلق لکھو۔"

بڑی بی بولیں:

"نہیں! مجھے اس سے بھی اتفاق نہیں کہ اللہ میاں کے پیدا کئے ہوئے کاغذ کا یوں غلط استعمال کیا جائے۔ اگر لکھنا ہی ہو تو اللہ اور رسول صلعم کی نعت لکھو اور ....."

"اے چپ بھی رہو بڑی بی تم!" نگینہ بولی۔

اور زہرہ کہنے لگی۔

"مشکل بھی تو یہی ہے کہ ہم لوگوں پر مغربیت کچھ اس قدر چھائی چلی جا رہی ہے کہ اسلام کی کوئی بات پسند ہی نہیں آتی۔ ہم یہ تو چاہتے ہیں کہ طرزِ بود و باش، تمدن۔ تعلیم، لباس غرض یہ کہ سبھی طرح سے نئی تعلیم کے پروانے بنی نظر آئیں لیکن یہ پسند نہیں کہ کوئی ہمیں اسلام کا نمونہ بھی کہے۔ ہماری باتوں سے اسلام کی شان اور عظمت بھی نظر آئے۔ بہن! انسان کی عظمت اور عزّت مذہب سے ہے۔ جس کے دل میں مذہب سے محبت ہے۔ اس کا ہمیشہ بول بولا رہے گا۔ ہر کس و ناکس اس کی عزّت بھی کرے گا اور ادب بھی۔ ہم کو خدا کا شکر گذار ہونا چاہیئے کہ اس نے ہمیں اسلام ایسی نعمت عطا کی۔ ہمیں اپنے حبیبؐ کی امت میں پیدا کیا۔ اس لئے یہ ہمارا بھی فرض ہونا چاہیئے کہ ہم بھی اسی مقدّس انسانؐ کے نقشِ قدم پر چلنے کی کوشش کریں جس کے نام پر ہمارے بھائی سر کٹوانا باعثِ فخر سمجھتے ہیں۔"

ادہر یہ باتیں ہو رہی تھیں کہ ادہر بڑی بی ساخفہ سے

کمرے میں جاکر اذان دینی شروع کر دی۔
الحمد للہ زہرہ کی باتوں کا اتنا اثر تو ہوا کہ دو چار لڑکیاں نماز پڑھنے کے لئے تیار ہو گئیں۔

پھوٹی قسمت

ایک روز ہنگامِ شب آسمان پر بادل چھائے ہوئے تھے، لیکن نہ تو بجلی ہی کوندتی، اور نہ بادل کی گرج ہی سنائی دیتی، پانی کے قطرے کسی بیکس کے آنسوؤں کی طرح بادلوں سے ٹپک رہے تھے اور ہوا مظلوموں کی آہوں کی طرح سسکیاں بھر رہی تھی، سازِ ہستی خاموش ہو چکا تھا۔ اور اس خامشی نے جس کی آغوش میں کسی شوقِ پوشیدہ کی ناکامیوں کی تلخ کامی مچل رہی تھی۔ دل کے جذبات کو پھر آمادۂ پیکار ہونے سے تھام رکھا تھا، برآمدے میں جو بام کے گملے رکھے تھے اُن پر بوندوں کے گرنے سے ایک ترنم ریز آواز پیدا ہو رہی تھی، اور میرے کمرے کی وہ گھڑی جس کی مسلسل ٹک ٹک اکثر میری مونسِ تنہائی ہوا کرتی ہے، آج خاموش تھی، میں صوفے پر لیٹا "انڈین لسنر" دیکھ رہا تھا، لیکن پروگرام حسبِ دستور آج بھی کچھ بے لطف سا ہی تھا، تاہم وقت کاٹنے کے لیے میں نے "میڈیم ویوز" پر لاہور لگا لا تو کوئی قوال یہ شعر گا رہا تھا ؎

مجھے خاک میں ملا کر مری خاک بھی اُڑا دے
ترے نام پر مٹا ہوں مجھے کیا غرض نشاں سے

غالباً یہ آخری شعر تھا، کیونکہ اس کے بعد کسی سکھ صاحب کے گانے کا اعلان کر دیا گیا، میں نے ریڈیو تو بند کر دیا اور کمرے میں آہستہ آہستہ ٹہلنے لگا ۔ میرے کانوں میں وہی ع

ترے نام پر مٹا ہوں مجھے کیا غرض نشاں سے

گونج رہا تھا، اور آنکھوں کے سامنے تصور نے ایک نقشہ سا کھینچ دیا تھا، کسی خانہ برباد کی تصویر جو اس حرماں نصیب کی بے تابیوں اور نامرادیوں کی داستان کچھ اس انداز سے کہہ رہی تھی کہ سننے والے کے دل میں شکایت یا شکوہ کا خیال تک پیدا نہ ہو۔

یہ تو سچ ہے کہ اگر دولت پاس ہو تو پھر عزت اور شہرت حاصل ہو سکتی ہے، زندگی کے یہ چار دن آرام اور آسائش سے کٹ جاتے ہیں، لیکن یہی دولت اُس داغ اور پریشانی کا جو قسامِ ازل نے کسی کے نصیب میں لکھ دی ہو، تدارک نہیں ہو سکتا، اگر کسی شخص کے پاس قارون کا خزانہ ہو۔ لیکن صحت اور تندرستی نہ ہو تو اُس کی زندگی اُس کے لئے وبالِ جان بن جاتی ہے ۔ اور اطمینانِ قلب کے بجائے یک گونہ

فکر دامن گیر رہتا ہے، اور جو صحت بھی ہو، تندرستی بھی ہو لیکن غنچۂ دل کسی وجہ سے مرجھایا رہتا ہو تو جان اندر ہی اندر گھلتی رہتی ہے اور وہ بدنصیب خونِ دل پیتا اور لختِ جگر کھاتا رہتا ہے۔ لیکن تصور نے جس شخص کا نقشہ میرے سامنے پیش کر رکھا تھا اُس کی زندگی دوسروں کے لیے قابلِ رشک تھی۔ عزت، شہرت، ثروت سبھی کچھ حاصل تھا لیکن یہ کسی کو معلوم نہ تھا کہ اس شخص کے دل میں بھی ایک خار کھٹک رہا ہے، اور اس خلفشار سے دنیا اس کے لئے جہنم سے بھی بدتر ہو رہی ہے۔ لیکن اس کی ظاہری کامرانیوں کے لحاظ سے اسے بلند اقبال کہوں تو یہ نام کچھ غیر موزوں نہ ہوگا۔ لیکن سوال یہ ہے کہ جب دنیا اس کے لیے مسرتیں راحتیں اور شہرت اپنے دامن میں لیے پھرتی تھی، تو اس پر کیا ایسی بنی تھی کہ وہ بھی کلیجہ تھام کر یہ کہے کہ ؎

مجھے خاک میں ملا کر مری خاک بھی اُڑا دے
ترے نام پر مٹا ہوں مجھے کیا غرض نشاں سے

بلند اقبال ایک عالی نسب خاندان کا چشم و چراغ تھا اور دولت اس کے گھر کی لونڈی تھی، ہر ایک شخص اس کے اخلاقِ حمیدہ کا دل سے گرویدہ تھا۔ بلند اقبال ع

با دوستاں تلطف با دشمناں مدارا

کے اصول پر کاربند تھا، دوستوں کی خاطر و مدارات سے اسے دلی مسرت حاصل ہوتی۔ اس کا ذرِ عطا کبھی شرمندۂ سوال نہ ہوتا۔

اس کے ہاں گاہے گاہے بزمِ طرب بھی گرم ہوتی، اسے شکار کھیلنے کا بھی بہت شوق تھا، اس کے شہر میں جب کوئی نئی فلم آتی تو وہ اپنے احباب کے ساتھ ضرور دیکھنے جاتا، اس کے سارے ہی چلن امیرانہ تھے لیکن اس کے ساتھ جگر کے اندر ایک خلش بھی تھی لیکن اس کا علم بلند اقبال کے سوا صرف خدا کو تھا۔

گو وہ عمر کی تیئیس منزلیں طے کر چکا تھا، لیکن اس نے ابھی تک شادی نہیں کی تھی۔ اور دوست احباب اُسے اکثر شادی کرنے پر مجبور کرتے رہتے۔ لیکن ان کی باتوں اور اصرار کا جواب اس کے کے پاس صرف ایک مسکراہٹ تھی۔

ایک روز وہ اپنے ایک دوست کے ساتھ بیٹھا چائے پی رہا تھا، مہرِ نیم روز کی سنہری شعاعیں کھڑکیوں کے شیشوں پر پریوں کی طرح رقص کر رہی تھیں، کچھ اِدھر اُدھر کی باتیں ہو رہی تھیں، پھر وہی شادی کا تذکرہ چھڑ گیا۔

"آخر تم شادی کرتے کیوں نہیں؟" دوست نے پوچھا۔

"بھئی!" بلند اقبال نے مسکرا کر کہا، "شادی کرنے کو تو عمر پڑی ہے۔"

"تینتیس چونتیس سال کے تو ہو لئے۔" دوست کہنے لگا۔ "تو اب کیا بوڑھے ہو کر ہی شادی کرو گے؟"

"ہاں!" بلند اقبال نے ہنس کر کہا، "میرے ایسے آدمی کو تو شادی اسی وقت ہی کرنی چاہیئے، جب عورت کی مدد کے بغیر زندگی بسر کرنی دوبھر ہو جائے۔"

"ذرا اس زندگی دوبھر ہونے کی تشریح بھی کر دیجئے۔" دوست نے کہا۔

"پہلے تم بتلاؤ کہ میں شادی کروں کس لئے؟" بلند اقبال نے کہا۔

"بقائے نسل کے لئے۔" دوست نے جواب دیا۔

"یہ کچھ ضروری نہیں۔" بلند اقبال نے جواب دیا۔

"آئینِ قدرت یہی ہے۔" دوست نے کہا۔

"یعنی شادی کرو تو بقائے نسل کے خیال سے کرو۔" اقبال نے کہا۔ "یہی مطلب ہے نا تمہارا۔"

"یہی" دوست نے کہا۔

"تو مجھے بقاء نسل کی ضرورت نہیں"۔ اقبال نے جواب دیا، "میں یہ تمام جائداد کسی قومی ادارے کے نام وقف کر دوں گا۔ میں اپنی زندگی کو پابندِ سلاسل نہیں کر سکتا"۔

"پابندِ سلاسل کیسے!" دوست نے پوچھا۔

"بیوی آئی تو جکڑ بند بھی پڑے"۔ اقبال نے جواب دیا، پھر آزادی کا خدا حافظ"۔

"گویا تم آزاد رہنا چاہتے ہو"۔ دوست نے پوچھا۔

"ہاں"۔

"سنو" دوست کہنے لگا۔ مرد اگر عورت کے حقوق کا پاس رکھے تو وہ کبھی اس کی آزادی میں مخل نہیں ہوتی"۔

"تو پھر تم نے عورت کی سرشت کا کبھی مطالعہ ہی نہیں کیا" بلند اقبال نے ہنس کر کہا۔

"اور تم نے" دوست نے پوچھا۔

"مجھے تو بدقسمتی سے اس کا موقع ہی نہیں ملا"۔ اقبال نے ہنس کر کہا۔

"بلند اقبال!" دوست کہنے لگا۔ "مرد کی دنیا عورت سے بنتی ہے۔

سُنا نہیں کہ وقت کی راگنی اور موسم کا پھل اپنے وقت پر ہی مزا دیتا ہے
شباب قدرت کا انمول عطیہ ہے اور عورت ایک لاجواب تحفہ،
جس طرح مرد کی دنیا عورت کے دمِ مسیحائی سے آباد ہوتی ہے اسی طرح
زندگی محبت کے راگ سے فروغ پاتی ہے۔ اب اگر انسان جانے بوجھے ان
خدا کی دی ہوئی نعمتوں سے فائدہ نہ اٹھائے تو یہ نہ صرف خلافِ فطرت
ہی ہوگا بلکہ سوسائٹی اسے ایک گناہ متصور کرے گی۔ خدا نے تمہیں ہر
وہ چیز عطا کر رکھی ہے جس سے دُنیا میں وقار حاصل ہوتا ہے چنانکہ جہاں
میں اعتبار ہوتا ہے۔ اب تم اپنا گھر آباد کرنے کی کوشش کرو اور پھر
دیکھو کہ ازدواجی زندگی کس قدر مسرت انگیز چیز ہے۔"

"زندگی کی تلخ کامی کہو" بلند اقبال نے مسکرا کر کہا۔

"تلخ کامی" دوست نے ہنس کر کہا ع۔ ہائے کمبخت تو نے پی ہی نہیں
ذرا اس کوچے سے واقف ہو جاؤ۔ پھر پوچھیں گے تم سے۔"

"پھر کیا ہوگا؟" بلند اقبال نے پوچھا۔

"پھر آپ ہوں گے اور گھر ہوگا۔" دوست نے جواب دیا۔

"تو کیا میں کولھو میں جتا کروں گا؟" اقبال نے پوچھا۔ "یا چکی پیسا
کروں گا؟"

"نہ کولھو میں جتو گے اور نہ چکی ہی پیسو گے" دوست بولا۔ بلکہ

ایک طرف ناز ہوں گے اور دوسری جانب ناز برداریاں۔"

"وہ کیسے؟"

"جب شادی کر لوگے تو سب معلوم ہو جائے گا۔" دوست کہنے لگا

خورشید جہاں کا باپ تو صرف تمہاری ایک ہاں کا منتظر ہے۔"

"میری ایک ہاں کا۔" بلند اقبال نے جس انداز سے مسکرا کر کہا، اگر کوئی سمجھنے والا ہوتا تو جان جاتا کہ اسی ایک مسکراہٹ میں امنگوں اور ارمانوں کی تباہی کی داستان مضمر ہے۔

پچھلا پہر تھا اور بلند اقبال اپنی عالیشان کوٹھی کے پائیں باغ میں ٹہل رہا تھا۔ شگوفوں کا موسم تھا۔ بید مشک کی ٹہنیوں پر پھول اس طرح آئے ہوئے تھے جیسے باغ جناں میں غلمان سبز حلے پہنے بیٹھے ہوں۔ آڑو کے ہلکے ہلکے پیازی رنگ کے ننھے ننھے سے پھول مشاطۂ قدرت کی مشاطگی سے کسی عروس نو کی طرح اپنے حسن اور بھبن پر خود بخود اترا رہے تھے، سبزہ کسی سرمست شباب کی طرح انگڑائیاں لے رہا تھا اور مٹر کے پھول کچھ اس طرح اچک اچک کر دیکھ رہے تھے جیسے تماشائی مختلف رنگوں کی پگڑیاں باندھے کسی میلے میں تماشہ دیکھ رہے ہوں، خیابانوں میں پانی بہہ رہا تھا۔ جب ہوا کا جھونکا آتا تو پھول ٹہنیوں

پرے جھک جھک کر پانی میں اپنا عکس دیکھنے لگتے، ایک چھوٹی سی چڑیا شاخ
نہال پر بیٹھی جھولا جھول رہی تھی، ایک گھٹ بڑھئی دو لھا بنا کسی پیڑ
پر بیٹھا کھٹ کھٹ کر رہا تھا، اور نسترن کے سائے میں ایک قمری اپنے
لخت جگر کو فن پرداز سکھا رہی تھی، لیکن اقبال کے لئے یہ اختلاط
قدرتی محض بے کیف تھے، اس وقت ان رنگ رنگ کے پھولوں اور
جھومنے والے اشجار کے بجائے اس کی وسعت نگاہ کے سامنے ایک
میدان تھا لق و دق، جہاں گورستان کی خاموشی مسلط تھی، ایک
فضا تھی، لیکن مسرت سے ناآشنا، درختوں کے ایک جھنڈ کے نیچے
مالی اور مالن بیٹھے راز و نیاز کی باتیں کر رہے تھے، گاہے گاہے
دونوں مسکرانے لگتے، بلند اقبال ایک آہ بھر کر بولا۔

"بیشک! دنیا عورت کے دم سے آباد ہوتی ہے،
کیف حیات اور زندگی صرف عورت ہی کا نام ہے،
خورشید جہاں! اس کا باپ صرف میری ایک ہاں کا منتظر!
ایک ہاں!! لیکن یہ کون جانے میری یہی ایک ہاں اس
پیکر محبوبی و خوبی کے لئے سامان بربادی بن جائے گی،
دنیا! دنیا! دنیا!! تو کیا مجھے اس دریدہ دہن دنیا کو ٹھوکا
دینا ہی پڑے گا، لیکن دنیا کی خاطر سوتی سے زیادہ خوشنما

اور قطرۂ شبنم سے زیادہ پاکیزہ خورشید جہاں کو کس طرح
سماج اور رسم و رواج کے شوالے پر بھینٹ چڑھا دوں
ایک دوشیزہ کے جذبات، ایک حسینہ کے ارمان، ایک
محبوب ہستی کی تمنائیں اور ایک معصوم لڑکی کی محبت
خودغرضی اور نفس پرستی کی قربان گاہ پر نذر چڑھا دینا
کتنا بڑا ظلم ہوگا"
دل پر ہاتھ مار کر
"لیکن اس دل کا کیا کروں، کاش میرے پہلو میں اس
دل کی بجائے پتھر کا ٹکڑا ہوتا"
میں شادی کیوں نہیں کرتا، کیا جواب دوں؟ کیا کہوں؟
یہ دولت، یہ عزت اور اس پر یہ داغ! قسمت!!
بلند اقبال کی آنکھوں میں آنسو بھر آئے، اس وقت کوئی چوڑی والا
پاس سے گذر رہا تھا، مالن نے اُسے بلوایا اور مالی نے دو چار آنے کی
چوڑیاں بیوی کو خرید دیں، مالن چوڑیاں پہن کر بہت خوش ہوئی،
جب چوڑیوں والا چلا گیا تو مالی نے اِدھر اُدھر دیکھ کر اسے اپنی آغوش
میں لے لیا۔

اقبال ایک درخت کی اوٹ میں کھڑا دیکھ رہا تھا، سر ہلا کر بولا

"بیشک عورت کو رام کر لینا کچھ مشکل نہیں، اگر ایک
عورت وہ چار بلوری چوڑیاں پا کر خوش ہو سکتی ہے تو
پھر میری دولت اور امارت خورشید جہاں کی دنیا کو اس
کے لئے فردوس نظر بنا سکتی ہے۔"

اس خیال سے اس کے چہرہ پر مسکراہٹ سی کھیلنے لگی، اور دل پر سے ایک بوجھ سا اٹھتا معلوم ہونے لگا۔

"زر!" اس نے ادھر ادھر ٹہلتے ہوئے کہا، "اگر بندے کو
خدا سے ملا سکتا ہے، تو پھر ایک عورت بھی مال و زر کی
صلاح کاریوں سے خوش رکھی جا سکتی ہے، بیشک!
اب خورشید جہاں میرے کاشانے کو خورشید خاور بن کر
منور کرے گی۔"

خورشید جہاں ایک تعلیم یافتہ لڑکی تھی، اسے دیکھ دیکھ کر گمان ہوتا کہ شاید حسن کی دیوی خورشید جہاں کے روپ میں جلوہ نما ہے۔ خورشید اپنے والدین کی اکلوتی بیٹی تھی اور بڑے ناز و نعمت سے پل کر پروان چڑھی تھی، دونوں گھرانوں میں رسم و راہ تھی، لہذا اقبال اور خورشید جہاں کا جب کبھی آمنا سامنا ہوتا تو دونوں ایک دوسرے کو دیکھ کر مسکرا دیتے اگر بات کرنے کا تو قسمت ہی سے موقع ملتا لیکن

نظروں ہی نظروں میں محبت کے پیام و سلام ہو جاتے۔

اکثر گھرانوں سے خورشید جہاں کے لئے پیغام آتے رہتے تھے، لیکن خورشید کے باپ کی نظرِ انتخاب بلند اقبال پر پڑ چکی تھی۔ لیکن اقبال کی مسلسل خاموشی اس کے لئے ایک معمّا تھا۔ ہاں جب اس کی طرف سے شادی کا پیغام پہنچا تو گھرانے میں مسرت کی لہر دوڑ گئی، اور پھر وہ روزِ سعید بھی آیا جب خورشید جہاں دلہن بن کر بلند اقبال کے گھر آئی۔

ڈرائنگ روم میں دلہن ایک صوفے پر لپٹی تھی، اور دو چار عورتیں اس کے پاس بیٹھی ہنسی مذاق کی باتیں کر رہی تھیں، لیکن جب اقبال آیا تو یہ عورتیں پاس سے اٹھ کر چلی گئیں، اور خورشید بھی ذرا سمٹ کر ہو بیٹھی، وہ بھی اس کے پاس ہی صوفے پر بیٹھ گیا، کچھ دیر تو نگاہِ شوق سے بیوی کی طرف دیکھتا رہا، پھر اس کا دستِ حنا مالیدہ اپنے ہاتھ میں لے لیا، اور ان جواہر نگار انگشتریوں کو جو اس کی پتلی پتلی انگلیوں میں جگنو کی طرح چمک رہی تھیں۔ دیکھنے لگا، پھر دوسرے ہاتھ سے دلہن کی ٹھوڑی ہلا کر بولا۔

"خورشید جہاں"!

لیکن، دلہن نے کچھ جواب نہ دیا۔

"دیکھو جی!" بلند اقبال اس کا ہاتھ دبا کر کہنے لگا، "تعلیم کا یہ ہرگز منشا نہیں کہ بیوی اپنے میاں سے یوں حجاب کرے، میں نے تو سنا تھا کہ تم بہت تعلیم یافتہ ہو لیکن خیر! معلوم شد بافندگی!"

یہ سن کر خورشید جہاں ذرا زیرلب مسکرا دی۔

"اجی جناب!" اقبال نے اس کے زانو کو ذرا دبا کر کہا۔

"میں یہ گونگی اشارتیں نہیں سمجھ سکتا، انسان اظہار محبت کے لئے بھی مسکراتا ہے۔ اور نفرت کے اظہار کے لئے بھی، کچھ ہوں ہاں تو کیجئے!"

لیکن جب جواب نہ ملا تو اس نے دلہن کے دونوں ہاتھ پکڑ لئے اور وہ گردن جھکا کر ہاتھ چھڑانے کی کوشش کرنے لگی، اسی کشمکش میں دوپٹہ ذرا سر سے سرک گیا۔ اقبال جھومر دیکھ کر بولا۔

"واللہ یہ جھومر تو تمہارا چہرے چاند کی طرح چمک رہا ہے!"

پھر ہنس کر

"لالچ کی بھی حد ہو گئی خورشید! یہ پانچ سات ہار جو تم نے گلے میں ڈال رکھے ہیں ان کا بوجھ تو محسوس نہ ہوتا ہوگا۔ ایسی خوبصورت اور صراحی دار گردن اور اس میں سیر سیر سونا، ارے توبہ! کیا کہنے ہیں اس شوق کے!"

لیکن خورشید نے اب بھی جواب نہ دیا، تو اقبال اُس کے اور بھی پاس ہو بیٹھا اور کہنے لگا۔

"یوں تو آپ بولنے سے رہیں۔ اب کوئی اور ہی تدبیر کرنی پڑے گی"

یہ کہہ کر اس نے اس کے تلووں میں جو گدگدی کرنی چاہی تو خورشید نے پاؤں اور بھی سمیٹ لئے۔ اقبال نے اب اس کے پہلو کی طرف جو ہاتھ بڑھایا تو خورشید نے ہاتھ پکڑ لیا۔ اقبال کچھ ایسے ہی چھڑانے کی کوشش کرنے لگا۔ لیکن جب خورشید نے ہاتھ نہ چھوڑا تو ہنس کر بولا۔

"خورشید! توبہ ہے، یہ اتنی طاقت کہاں سے آگئی تم میں، بھئی میرا ہاتھ چھوڑ دو۔"

"چھڑا لیجئے!" خورشید نے ایک نگاہِ غلط انداز سے شوہر کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

"شکر ہے!" اقبال نے اس کے ہاتھ کو بوسہ دیتے ہوئے کہا۔ "کفر ٹوٹا خدا خدا کر کے!"

یہ کہہ کر اس نے جیب سے سونے کی بھنوی شکل کی ایک نہایت خوبصورت اور قیمتی رسٹ واچ نکالی اور بیوی کی کلائی پہ باندھ کر پوچھا:-

"فرمائیے! یہ تو پسند ہے؟"

"معلوم نہیں!" خورشید نے زیرلب مسکراتے ہوئے کہا۔
"کچھ نقص ہے اس میں؟" اقبال نے پوچھا۔
"معلوم نہیں!" خورشید نے پھر اسی انداز سے جواب دیا۔
"پھر پسند کیوں نہیں؟"
"معلوم نہیں"
اقبال نے ایک آہ بھر کر بیوی کا ہاتھ چھوڑ دیا اور بولا۔
"یہ گھر تو پسند آیا؟"
"معلوم نہیں!" خورشید نے پھر اسی طرح زیرلب مسکرا کر کہا اور ساتھ ہی ایک جمائی بھی لی۔
"نیند آرہی ہے آپ کو؟"
لیکن خورشید نے پھر ایک دل کش ادا سے سر ہلا کر کہا:۔
"معلوم نہیں!"
"خورشید!" اقبال ہنس کر کہنے لگا، "وہ طوطے والا قصہ تو یاد ہے نا جسے "در ایں چہ شک" کے سوا کچھ آتا ہی نہ تھا۔ اسی طرح آج بھی یہ معلوم ہوا کہ ہماری بی بینا بھی "معلوم نہیں" کہنے کے سوا اور کچھ جانتی ہی نہیں!"
خورشید جہاں کو ہنسی سی آگئی، لیکن یہ ہنسی کیا تھی ایک ناشگفتہ کلی تھی جو کھل گئی۔

"خورشید!" اقبال نے اس کا ہاتھ سہلاتے ہوئے کہا، آج خدا نے ہماری ایک دیرینہ آرزو پوری کی ہے، تم بھی تو خوش ہو گی؟"

خورشید نے ایک نگاہِ نیم باز سے شوہر کی طرف دیکھا، لیکن پیشتر اس کے کہ وہ کچھ جواب دے، اقبال نے ہنس کر کہا۔

"دیکھو جی! اب نہیں وہی "معلوم نہیں" ہرگز نہیں سنوں گا۔"

"جس کی آرزو پوری ہوئی ہو گی خوش بھی وہی ہو گا۔" خورشید نے ذرا لچک کر جواب دیا، لیکن لچکنا کیا تھا پھولوں بھری ڈالی تھی جو ذرا ہل گئی تھی۔

"اچھا"! اقبال نے اس اچھا کو ذرا لمبا کر کے اور سر ہلا کر کہا، "تو تم خوش نہیں؟"

"آخر خوش ہونے کی کوئی بات بھی تو ہو؟" خورشید نے ذرا تیکھی چتون سے شوہر کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

"واہ صاحب واہ!" اقبال نے بیوی کے زانو پر ہولے سے ہاتھ مار کر کہا۔

"یہ ہاتھ سنبھالئے اپنا۔" خورشید نے شوہر کا ہاتھ جھٹک کر کہا۔

"میرا زانو لوہے کا نہیں۔"

"غلطی ہوئی معاف کر دو" اقبال نے ذرا اس کی طرف جھکتے ہوئے کہا۔ "کہو بھی، دو خورشید معاف کیا۔"

لیکن جب خورشید نے جواب نہ دیا تو اقبال نے کہا۔

"معاف نہ کروگی؟"

خورشید جہاں نے ایک نگاہِ غلط انداز سے شوہر کی طرف دیکھا اور کہا "نہیں۔"

ساتھ ہی ایک موجِ تبسم اس کے لب لعلیں پر رقص کرنے لگی۔

"اچھا صاحب!" اقبال نے بناوٹ سے ایک آہ بھر کر کہا، "نہ معاف کیجیے۔" ع

ہم ایسے ہیں کہ جیسے کسی کا خدا نہ ہو

"اچھا میری بات کا تو جواب دیجیے!"

"کیا؟"

"تم خوش ہو کہ میں تمہارے پاس بیٹھا ہوں۔"

"اس میں میرے خوش ہونے کی کیا بات ہے۔" خورشید نے کہا۔

"میرے خیال میں؟" اقبال بولا، "ہر عورت یہی چاہتی ہے کہ اس کا شوہر اس کے پاس بیٹھا ہو۔"

"اس قسم کی فضول خواہشیں آپ مردوں ہی کو ہوا کرتی ہیں"،

خورشید نے جواب دیا۔

"فضول خواہش!" اقبال نے پوچھا "وہ کیسے جناب!"

"یہ سب بکھیڑے بھی تو اسی فضول خواہش کا نتیجہ ہیں" خورشید نے کہا۔

"کیسے بکھیڑے خورشید!" اقبال نے پوچھا۔

"یہی" خورشید نے ذرا مسکرا کر اور شوہر کی طرف دیکھ کر کہا۔

"سمجھ گیا" اقبال نے ہنس کر کہا۔ لیکن یہ تو عین فطرت کے مطابق ہے۔"

"کیا؟" خورشید نے کہا۔

"دنیا مرد اور عورت سے بنتی ہے۔" اقبال نے جواب دیا۔

"اللہ میاں کو دنیا آباد کرنی ہوتی تو آپ کو جنت میں رہنے کو جگہ نہ دی ہوتی۔" خورشید نے ہنس کر کہا۔

"اجی فلسفی صاحب!" اقبال نے اسے اپنی آغوش میں لیتے ہوئے کہا۔ "لیکن اس کی بھی تو داد دیجئے کہ خدا سے مانگا تو کیا مانگا۔"

"خودغرضی بھی تو اسی کا نام ہے۔" خورشید نے کہا۔

"پھر شادی کرنا بھی خودغرضی ٹھہرا؟" اقبال نے کہا۔

"اس میں شک ہی کیا ہے۔" خورشید نے مسکرا کر جواب دیا، "اپنے آرام کے لئے دوسرے کو مصیبت میں ڈالنا خودغرضی نہیں تو اور کیا ہے؟"

"یہ الٹی گنگا بہانی بس کوئی تم سے ہی سیکھے۔" اقبال نے جواب دیا "غریب مرد تو عورت کے آرام اور راحت کے لئے جوکھوں میں پڑتا ہے اور لیجئے یہاں انعام کیا مل رہا ہے، حد ہو گئی آپ کی قدر دانی کی بھی۔"

اس وقت اس سنہری کلاک نے جو مینٹل پیس کے اوپر اور شیشے کے گلوب میں رکھا تھا گیارہ بجائے، خورشید نے ایک جمائی لی۔

"اوہو" اقبال بولا "تمہیں نیند آرہی ہے۔"

یہ کہتے ہوئے وہ اٹھا اور جب بیوی کو بھی ہاتھ سے پکڑ کر صوفے پر سے اٹھانا چاہا تو وہ ذرا تن کر بیٹھ گئی، اقبال نے جھوٹے سے ذرا زور لگایا لیکن خورشید پھر بھی نہ اٹھی تو یہ کہتے ہوئے کہ "ایک خطا تو ابھی معاف نہیں ہوئی، دیکھیں اب اس دوسری پر کیا سزا ملتی ہے۔" وہ جھک کر جو اسے گود میں لینے کی کوشش کرنے لگا تو خورشید خود ہی اٹھ کر کھڑی ہو گئی، اور کبک کی طرح قدم قدم پر جھومتی ہوئی شوہر کے ہاتھ میں ہاتھ دیئے حجلۂ عروسی میں آئی۔ آج اس کمرے میں بلور کے مختلف رنگوں کے فانوسوں میں موم بتیاں جل رہی تھیں۔ ایک خوبصورت پلنگ پر پرتکلف بستر ہو رہا تھا اور سمن کے پھولوں کی نازک نازک پنکھڑیاں بستر پر بکھری ہوئی تھیں، ان کی خوشبو سے مشام جان تازہ ہو رہا تھا

اقبال نے بیوی کو پلنگ پر بٹھا دیا، اور خود ایک کرسی کھینچ کر پاس ہو بیٹھا سامنے کی دیوار پر ایک تصویر تھی، ایک حسین عورت ایک جوان مرد کو شراب پلا رہی تھی۔ عورت کے ایک ہاتھ میں صراحی دوسرے میں جام تھا، اس میں بادۂ ناب چھلک رہا تھا۔ مرد کہنی کی ٹیک لگائے قالین پر لیٹا ہوا تھا۔ اور ایک ہاتھ جام کی طرف بڑھا رکھا تھا۔

"خورشید!" اقبال نے تصویر کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا "یہ ہے خواب زندگی کی تعبیر" اب خورشید نے بھی تصویر کی طرف دیکھا، پھر مسحور کن نگاہوں سے شوہر کی طرف دیکھ کر ذرا مسکرا دی۔ اقبال بولا

"خورشید! یہ تصویر ہمیں پیغام حیات دے رہی ہے، بھلا غور تو کرو، ایک مرد کے لئے اس سے زیادہ مسرت کی اور کیا گھڑی ہو گی کہ ایک محبوبۂ طناز اپنے نازک ہاتھوں سے شراب پلائے، وہ شراب جس سے کیف حیات حاصل ہوتا ہے، وہ کیف جو جذبات کو پیغام بیداری دیتا ہے۔ وہ بیداری جس سے دل کو راحت ملتی ہے۔ وہ راحت جس سے زندگی زندگی کے مقصد سے بہرہ یاب ہوتی ہے۔ اور لذت شباب سے آشنا اور وہ لذت شباب جس سے خیالات میں رنگینی پیدا ہوتی ہے۔

اقبال نے یہ الفاظ ایک ایک کر کے کہے، خورشید نے مسکرا کر کہا "ہو چکی شاعری!"

"خورشید"! اقبال بیوی کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لے کر بولا، جب شباب ہو اور محبت کامراں ہو اور دل میں امنگ ہو اور امنگ کو ابھارنے والا محبوب جاں نواز پہلو میں ہو اور جب ہمائے سعادت سر پہ منڈلا رہا ہو اور خوابوں کی دنیا آباد کرنے والا پیکرِ خوبی و محبوبی اقبال کی بلندیوں اور آرزو کی مراد مندیوں کا مژدہ جانفزا اپنے لبِ لعلیں سے نہ سہی اپنی نرگسی آنکھوں سے ہی دے رہا ہو، اُس وقت اگر کوئی گناہ بھی کر بیٹھے تو کوئی گناہ بھی نہیں"

یہ کہتے ہوئے اقبال اُٹھ کر کھانے والے کمرے میں گیا اور شراب کی بوتل اور ایک بلوری گلاس اٹھا لایا، خورشید نے کچھ کچھ سہمی سہمی نظروں سے شوہر کی طرف دیکھا، اقبال نے کرسی پر بیٹھ کر بوتل کھولی اور تھوڑی سی شراب گلاس میں ڈال کر بلوری صراحی میں سے جو پلنگ کے پاس ہی ایک میز پر رکھی تھی اس میں پانی ملایا اور گلاس ہلا کر بولا۔

"خورشید! بتلاؤ اس میں کیا ہے؟"

خورشید نے کچھ جواب نہ دیا۔ اقبال ہنس کر کہنے لگا:۔

"خورشید! اس گلاس میں میری آرزو، میری امید، میرے شوق اور تمناؤں کو لذت خواب سے آشنا کرنے والا جوہر ہے، وہ جو ہر حسن سے

زندگی پریشانیوں اور تفکرات سے نجات پاتی ہے، اس جوہر کے پینے سے دل میں ایک ایسا سرور پیدا ہوتا ہے جو کم و کیفِ حیات سے بے پرواہ کر دیتا ہے۔"
یہ کہہ کر اقبال نے گلاس منہ سے لگا لیا، اور خورشید کو ایسا معلوم ہونے لگا گویا اس کے آئینۂ دل پر غبار سا چھا رہا ہے۔

اقبال پے در پے تین چار گلاس پی گیا۔ شراب تند تھی اور پینے والا ناتجربہ کار، اسے قے پر قے ہونے لگی۔ لیکن حالت یہ تھی کہ ادھر قے ہوئی اُدھر اور پی لی۔ اسی طرح پیتے پیتے وہ کرسی پر سے لڑھک کر فرش پر گرا، بوتل ہاتھ سے چھوٹ گئی۔ اور تن بدن کا ہوش نہ رہا، خورشید جہاں شوہر کی یہ حالت دیکھ کر پلنگ پر بیٹھی اپنی قسمت پر آنسو بہا رہی تھی۔ آج اس کے لئے بستر کا ہر تار خارِ بستر بنا ہوا تھا۔

بہت سے لیل و نہار اسی طرح گذر گئے، خورشید کے آرام کے لئے دولت جو کچھ مہیا کر سکتی تھی سب موجود تھا لیکن اقبال دیکھتا تھا کہ اس کے دل کی کلی مرجھائی سی رہتی ہے۔ اسے خورشید سے والہانہ محبت تھی، اسے اپنی بیوی کے حسن و جمال پر ناز بھی تھا، لیکن وہ یہ سمجھ چکا تھا کہ محض دولت کی فراوانی عورت کو خوش نہیں کر سکتی۔ دن تو جس طرح کٹتا سو کٹتا لیکن ادھر رات ہوئی اور ادھر وہی ؎ ابھی تو شغلِ شراب میں ہوں۔

ایک روز دونوں ایک حوض کے پاس پیڑوں کے سائے میں بیٹھے چائے پی رہے تھے۔ آسمان پر ہلکی ہلکی بدلیاں چھائی تھیں۔ سورج جب چہرے پر سے ان بدلیوں کی نقاب اُلٹ دیتا تو پانی پر گمان ہونے لگتا کہ نیلگوں آسمان پر سے کوثر کا عکس چھن چھن کر آ رہا ہے۔ کہیں سے قمریوں کا ایک جوڑا حوض کے کنارے پر آ بیٹھا۔ دونوں پرندوں نے پانی کے دو دو قطرے پیے اور پھر ایک دوسرے سے اختلاط کرنے لگے۔ لالہ ریز زمین اور عطر بیز ہواؤں کے اثر سے دونوں کے جام زندگی سے مستی ٹپکتی معلوم ہوتی تھی۔ خورشید جہاں پیالی پکڑے قدرت کی ان حسین تصویروں کو دیکھ رہی تھی اور اقبال اپنی بیوی کی طرف دیکھ رہا تھا۔

"کس خیال میں ہو خورشید!" اقبال نے بیوی کے ہاتھ پر ہاتھ رکھ کر پوچھا۔

"کچھ نہیں" کہتے ہوئے خورشید نے پیالی منہ سے لگالی۔

"کچھ تو ہے جس کی پردہ داری ہے" اقبال نے مسکرا کر کہا۔

"اب پردہ داری کیسی؟" خورشید نے شوہر کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ "پردہ تو آپ نے پہلے ہی روز اٹھا دیا۔"

اقبال نے ایک آہ بھری اور اس کی مرصع چوڑیوں کو اوپر نیچے پھیر کر بولا۔ "میری مجبوریوں ......"

لیکن خورشید بات کاٹ کر بولی ۔

"ہاں انسان عادت سے مجبور ہو ہی جاتا ہے"

"عادت" اقبال نے بیوی کی طرف دیکھتے ہوئے کہا "شراب پینے کی؟ تمہارے سر کی قسم، نہ پہلے پی تھی نہ اب ہے"

"تو پھر آپ نے منت مانی ہو گی" خورشید طنزاً بولی ۔

"خورشید!" اقبال نے پھر آہ بھر کر کہا، منت نہیں بلکہ محض نامرادیوں کی تلخ کامی سے بچنے کے لئے پیتا ہوں"

"نامرادیوں کی تلخی" خورشید نے چائے دانی پر سے ٹی کوزی اٹھاتے ہوئے کہا "اور خانہ بربادیوں کا ماتم!"

"سچ ہے" اقبال بولا، "دنیا کی خاطر ذلیل ہونے کی یہی سزا ہونی چاہیئے، ایک معصوم دوشیزہ کی زندگی برباد کرنے پر جتنا بھی عذاب ملے کم ہے، خورشید! میری خانہ سامانیوں کا ماتم اب میری وہ حسرت کرے گی جس حسرت کے میرے سینے پر ہزاروں داغ ہیں"

"خیر" خورشید نے پیالی میں شکر ڈالتے ہوئے کہا، شراب نے آپ کے خیالات کو رنگین تو خوب بنا دیا ہے" یہ کہہ کر وہ ذرا مسکرائی۔ اور اقبال نے اس کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لیتے ہوئے کہا:۔

"نہیں بلکہ مجھے سیل حوادث کے تھپیڑے کھانے کے قابل بنا دیا ہے۔

میرے تفکرات اور پریشانیوں کا بس یہی ایک علاج ہے۔"

"لیجیے!" خورشید نے پیالی بڑھاتے ہوئے کہا۔ "چائے تو پیجیے!"

"خورشید!" اقبال بولا، "میں خونِ دل پیتا ہوں کیونکہ ..."

"کیونکہ" خورشید نے بات کاٹ کر کہا۔ "کہ مجھ ایسی منحوس آپ کے پلے پڑ گئی۔"

"ایسا مت کہو خورشید!" اقبال بیوی کی طرف دیکھ کر بولا، "پہلے تم میرے خوابوں کی دنیا آباد کیا کرتی تھیں، اب تم سے میرے کاشانۂ دل کی رونق ہے، پہلے آنکھیں تمہیں دیکھنے کو ترستی تھیں، اب آنکھ تمہاری دید کو عبادت سمجھتی ہے۔"

"یہ تو آپ نے سچ کہا" خورشید نے ذرا مسکرا کر کہا۔ "برہمن بھی تو دنیا کو دھوکا دینے کے لئے بت کو پوجتا ہے، حالانکہ دل میں خوب سمجھتا ہے کہ ان مٹی کے خداؤں میں نہ توفیق جزا ہے اور نہ سزا دینے کی قدرت۔"

"تمہیں حق ہے خورشید!" اقبال نے ایک آہ بھر کر کہا، "جو چاہو کہہ لو۔"

"یہ حق کی بھی آپ نے ایک ہی کہی" خورشید نے شوہر کی طرف دیکھتے ہوئے جواب دیا، "اگر میرا بھی کچھ حق ہوتا تو پھر یہ راز داریاں

بھی مجھ سے نہ ہوتیں، آپ کو ایک عورت، ایک ایسی عورت جو آپ کی لونڈی بن چکی ہے کے احساسات، تفکرات یا جذبات کا بھی کچھ خیال ہوتا، یہ نہیں کہ دن گپ شپ میں گذرا اور رات شغل شراب کی نذر ہوگئی سنیئے، جس طرح وہ ڈالی جو خزاں کے موسم میں ٹوٹ جائے، اتنے بہار سے کبھی ہری نہیں ہوسکتی، اسی طرح اگر ایک عورت ایک بار بدگمانیوں کا شکار ہو جائے تو پھر مرد اگر فرشتہ بھی بن کر دکھا دے تو بھی اُسے یقین نہیں آسکتا، آپ نے مجھے ایک مدت سے تذبذب میں ڈال رکھا ہے، لیکن آپ نے کبھی یہ بھی سوچا کہ آپ کی یہ گنگ اشارتیں مجھے کیسے کیسے مغالطوں میں ڈال رہی ہوں گی، میرا دل کیسے کیسے خیالات کی آماجگاہ بن رہا ہو گا"

یہ کہنے کے ساتھ ہی خورشید کی نرگسی آنکھوں میں آنسو بھر آئے اور اقبال نے سر جھکا لیا۔

کچھ دیر دونوں خاموش بیٹھے رہے، آخر اقبال نے سر اٹھا کر بیوی کی طرف دیکھا اور کہا۔

"خورشید! تم ایک ایسے بدبخت کے پلے پڑی ہو جو عورت کی محبت کے قابل نہیں، ایک دنیا کے تقاضوں سے تنگ آکر۔۔ نہیں! نہیں!

تمہاری محبت نے مجھ سے ایک ایسے گناہ کا ارتکاب کروایا جس کے لئے میں خدا کا بھی گنہگار، اور تمہارا بھی۔"

یہ کہنے کے ساتھ اقبال کی آنکھوں سے اشک ندامت ٹپکنے لگے خورشید صورت تصویر خاموش بیٹھی شوہر کی طرف دیکھ رہی تھی، اقبال بھرائی ہوئی آواز سے بولا۔

"مجھے معاف کر دو خورشید! اب میری لاج تمہارے ہاتھ میں ہے۔"

خورشید نے ایک لانبا سانس لیا۔ اور بولی۔

"میں تو آپ کی کنیز ہوں، آخر کچھ میرا بھی آپ پر حق ہے۔"

"حق" اقبال نے اپنی آنسوؤں سے بھیگی ہوئی آنکھوں سے بیوی کی طرف دیکھ کر کہا۔ "خدا کی قسم تمہیں خوش دیکھنے کے لئے اگر مجھے اپنی جان بھی قربان کرنی پڑے تو انشاء اللہ کبھی تاخیر نہ کروں گا۔"

"آپ کی جان آپ کو سلامت رہے"، خورشید بولی، مجھے اتنی بڑی قربانی کی ضرورت نہیں، میری تو ایک بہت معمولی سی درخواست ہے۔"

"کیا؟" اقبال نے پوچھا۔

"آپ پہلے ماننے کا وعدہ کریں" خورشید بولی۔ "پھر کہوں گی۔"

"تمہارے سر کی قسم" اقبال بولا۔ "جو کہو منظور ہے۔"

"تو پھر آپ شراب پینی چھوڑ دیجئے۔" خورشید نے کہا، "مجھے اس کو

سخت نفرت ہے !"

بس آج سے میرے لئے حرام ہے "۔ اقبال نے بیوی کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لیتے ہوئے کہا۔ جانے خورشید کے دل میں کیا آئی۔ وہ مسکرا کر بولی

" لیکن جناب ! سچ ؎

چھٹتی نہیں ہے منہ سے یہ کافر لگی ہوئی !"

"بس آج سے چھوٹ گئی" اقبال بولا "خورشید ! میں تو اپنی ندامت کی پردہ پوشی کے لئے صرف پیتا تھا"

"ندامت کی پردہ پوشی" خورشید نے مسکرا کر شوہر کی طرف دیکھا اور کہا "باتیں بنانی آپ کو خوب آتی ہیں"

اور اقبال نے بیوی کا نرم اور نازک ہاتھ چوم کر کہا۔

"خورشید ! خدا کی قسم !"

وہی مجھ کو عیش دوام ہے جو کرے تو ایک نظر سی خوش"

اقبال کو شکار کا بہت شوق تھا۔ اس نے خورشید کو بھی بندوق چلانی سکھادی، اب میاں بیوی دونوں شکار پر جاتے، کبھی دو دو چار چار روز جنگل میں قیام رہتا۔ لیکن خورشید کے دل کی کلی مرجھائی سی رہتی اقبال کو سواری کا شوق تھا۔ اس نے خورشید کے لئے بھی ایک عربی گھوڑا خریدا

اُس نے گھوڑے کی سواری سکھلائی، پھر سواری کے لئے لباس بنوائے اب دونوں میاں بیوی گھوڑوں پر سوار ہو کر علی الصباح سیر کو بھی جاتے لیکن خورشید کا غنچۂ دل شگفتہ نہ ہوتا۔ شادی سے پہلے بھی اقبال کے پاس ایک چھوڑ دو موٹریں تھیں۔ لیکن خورشید کی خاطر اس نے ایک موٹر اور خریدی، یہ موٹر خورشید ہی چلایا کرتی اور کبھی نقاب ڈال کر خرید و فروخت کے لئے شوہر کے ساتھ بھی جاتی۔ لیکن چہرے پر اُداسی کی جو وہ ایک جھلک تھی چھپائے نہ چھپتی، اقبال اکثر اپنے دوستوں کو کبھی چائے پر اور کبھی کھانے پر مدعو کیا کرتا تھا۔ لیکن اب دوستوں کو ایسا موقع تو قسمت سے ہی میسر ہوتا۔ لیکن خورشید کے ملنے جلنے والیاں عموماً آتی جاتی رہتی ہیں۔ لیکن وہ شگفتگی جو ایک جوان عورت کا زیور ہوتی ہے مفقود تھی۔

ایک روز دونوں کھانا کھا رہے تھے، خادم نے چاندی کی طشتری میں دو کارڈ رکھ کر پیش کئے، گورنر کو پارٹی دی جا رہی تھی۔ یہ اسی پارٹی کے کارڈ تھے، ایک اقبال کے نام تھا اور دوسرے پر مسز اقبال لکھا ہوا تھا خورشید اپنا نام دیکھ کر بولی۔

"لو! یہ اچھی رہی۔"

"کیا؟" اقبال نے پوچھا۔

"یہ کسی نے میرے نام بھی ایک ٹکٹ بھیج دیا ہے،" خورشید نے ذرا مسکرا کر کہا۔

"پھر تو بہت اچھا ہوا" اقبال نے کہا۔ "ورنہ مجھے خود منگوانا پڑتا۔"

"تو کیا اب میں پارٹی میں بھی جاؤں گی؟" خورشید نے تعجب سے پوچھا، "تو اس میں حرج ہی کیا ہے۔" اقبال نے جواب دیا، "اور عورتیں بھی تو ہوں گی۔"

"لیکن وہ پردہ بھی تو نہیں کرتیں۔" خورشید بولی۔

"اور تم بھی تو نہیں کرتیں۔" اقبال نے جواب دیا۔

"سبحان اللہ!" خورشید ایک دل کش ادا سے سر ہلا کر بولی

"ماشاءاللہ!" اقبال نے بیوی کی طرف دیکھ کر کہا، "کیا حسن ہے کیا زیبائش ہے، کیا رعنائی ہے، کیا ۔ ۔ ۔ ۔"

"کیا حماقت ہے؟" خورشید بات کاٹ کر بولی۔

"کیوں جی!" اقبال نے پوچھا، "اس میں حماقت کی کیا بات ہے؟"

"یہی" خورشید بولی، "کہ آپ مجھے غیر مردوں کے سامنے جانے کو کہتے ہیں۔"

"معاف کر دیجئے۔" اقبال ہنس کر کہنے لگا۔ "بھول ہو گئی، آپ اور غیر مردوں کا سامنا! اجی توبہ! ہاں ان دو خدمتگاروں کا تو ذکر ہی کیا یہ چونکہ آپ کے ملازم ہیں اس لئے ان کا تو غیر مردوں میں شمار ہی نہیں، اسی طرح دونوں شوفر بھی آپ کے یہاں نوکر ہیں۔ اس لئے کوئی انہیں بھی غیر مرد نہیں کہہ سکتا۔

اب رہے دو مالی تو وہ آپ سے تنخواہ پاتے ہیں لہذا انہیں بھی غیر مرد نہیں کہا جا سکتا، پھر باورچی ہے، چوکیدار ہے، گھسیارے ہیں، گوالا ہے، دھوبی اور مہتر ہے، یہ چونکہ سب آپ کی سرکار میں ملازم ہیں اس لئے ظاہر ہے کہ یہ بھی غیر مرد نہیں ہو سکتے، غیر تو بس ہمارے ہی غریب دوست ہیں اس لئے ان سے پردہ کرنا ضروری ہے۔ کیونکہ ان میں سے اگر کوئی آپ کو دیکھ پائے تو بس ہماری تو ناک ہی کٹ گئی۔"

خورشید ہنس کر بولی۔

آپ کی ناک کٹنے کا سوال نہیں، سوال تو خاندان کی عزت کا ہے۔"

"خورشید!" اقبال نے مسکرا کر کہا، کیا پاگلوں کی سی باتیں کر رہی ہو، میری جان ع

آنکھ کو چاہیئے ہر رنگ میں وا ہو جانا"

"خواہ آنکھ رہے یا نہ رہے!" خورشید نے ہنس کر کہا۔

دونوں میں اسی طرح ہنسی مذاق ہوتا رہا، آخر خورشید نے پارٹی میں شامل ہونے کا وعدہ کر لیا۔

گورنر کی پارٹی میں خورشید جہاں اس شان سے گئی کہ بس ع

تمہی تم ہو خدا رکھے نظر پڑتی ہے عالم کی

ہزار بارہ سو کا مجمع تھا، باغ میں جا بجا میزیں لگی تھیں، چار چار پانچ پانچ

مل کر بیٹھے خوش گپیاں کر رہے تھے۔

اقبال اور خورشید بھی ایک صنوبر کے درخت کے سائے میں کرسیوں پر جا بیٹھے، یہ ابھی بیٹھے ہی تھے کہ اقبال کے دوست بھی آ گئے ان میں سے ایک احسن اور اس کی بیوی ثریا تھی جو خورشید کی سہیلی تھی، دوسرا الحسن، ایک نوجوان بیرسٹر تھا۔

اتنے بڑے مجمع میں شامل ہونے کا خورشید کو چونکہ پہلا موقع تھا اس لئے وہ ذرا شرمائی سی بیٹھی تھی، اس سے ثریا مذاق اڑانے لگی ان لوگوں سے تھوڑے ہی فاصلے پر چار اور مہمان کرسیوں پر بیٹھے تھے، ان کی نگاہیں خورشید پر جمی ہوئی تھیں۔ ان میں سے ایک نے کہا:۔

"کیا حسن ہے"

اور دوسرا بولا

"حسن تو ہے لیکن غیرت نہیں"

"کون لے گیا غیرت؟" پہلے نے پوچھا

"یہ آپ کا مغربی تمدن" دوسرے نے جواب دیا۔

اور تیسرا بولا

"کم از کم اقبال سے تو یہ توقع نہ تھی"

اور چوتھے نے کہا۔

"ہاں اچھا شریف گھرانا تھا۔"

"کون لے گیا شرافت" پہلے نے پھر کہا

"فیشن کی نذر ہو گئی" دوسرے نے جواب دیا۔ "دیکھو تو یہ وہی خورشید ہے جو سات پردوں میں رہتی تھی۔ اور آج تماشہ بنی بیٹھی ہے"

ادھر ثریا خورشید سے کہہ رہی تھی۔

"یہ بھیگی بلی کیوں بنی بیٹھی ہو؟"

پاس سے احسن بولا

"تو گرفتار ہی تو ہیں"

"مجمع عام میں آنے سے حجاب کیسا، کوئی نگل تو جاتا نہیں" بیرسٹر صاحب نے کہا۔

ادھر وہی پہلا کہہ رہا تھا۔

"یہ پردہ ہی تو ہم لوگوں کے تنزل کا باعث ہے"

اور دوسرے نے کہا۔۔۔ اور یہ بے غیرتی ہی تو ہماری تباہی کا پیش خیمہ ہے"

"بہرکیف"! اب تیسرے صاحب کہنے لگے

"اقبال کی پسند کی داد دینی چاہئیے۔"

"داد لینے ہی تو بیوی کو مجمع عام میں لایا ہے۔" پہلے نے کہا۔

"بے غیرتی کی بلا دور" چوتھے نے ہنس کر کہا
"ارے یار" پہلا بولا "دیکھ لینا، ایک دن یہ تمہارا پردہ داستان ہو کر رہ جائے گا۔"
اور چوتھے نے مسکرا کر کہا
"انشاءاللہ! پھر ع
تمہاری داستاں تک بھی نہ ہوگی داستانوں میں"

ادھر احسن صاحب اقبال سے کہہ رہے تھے۔
"یہ آپ کس سوچ میں بیٹھے ہیں؟"
"ذرا دنیا کا رنگ دیکھتا ہوں" اقبال نے جواب دیا۔
اور محسن صاحب فرمانے لگے۔
"جانے یہ لوگ خورشید کو آج یہاں دیکھ کر کیا خیال کر رہے ہوں گے!"
"لوگ جو چاہے خیال کریں، ثریا بولی لیکن میری تو ایک دیرینہ آرزو آج پوری ہو گئی۔"
"کیا آرزو تھی آپ کی؟" احسن نے بیوی سے پوچھا۔
"یہی" ثریا بولی "کہ خورشید بھی میرے ساتھ جلسوں میں شامل ہوا کرے۔"
اور محسن نے کہا

آزادی سے بہتر دنیا میں اور کوئی چیز نہیں کیا خیال ہے آپ کا مسٹر اقبال"
خورشید صرف مسکرا دی۔
"غضب تو یہ ہے" محسن نے کہا "عورت کی نسوانی کمزوری کبھی اس کا پیچھا چھوڑتی ہی نہیں"
"اجی جناب" ثریا بولی، "یہ ہندوستان ہے، یورپ نہیں"
"جی ہاں!" محسن نے ہاں کو ذرا لمبا کر کے کہا "مجھے بھی معلوم ہے کہ میں ایک غلام ملک میں بیٹھا ہوں"
"اوہو" اقبال نے ہنس کر کہا۔ کب سے معلوم ہوا آپ کو؟"
اور محسن بولا
"یورپ جا کر ہی آنکھیں کھلی ہوں گی، کیوں محسن!"
"جی ہاں" محسن کہنے لگا، "یورپ سے واپس آکر ہی اپنی ذلت اور عورت کی بے کسی کا احساس ہونے لگا ہے!"
اب اقبال بولا
اس ذلت اور بے کسی کا ذمہ دار کون ہے؟"
ہم لوگ!" محسن نے جواب دیا۔
"اور اس کا علاج" اقبال نے پوچھا
"پہلے عورت کو آزادی دیجیے" محسن نے کہا "پھر اس معاشرت کو

قبول کیجئے جو مہذب قوموں کا چلن ہے۔"

"یعنی" اب احسن نے ہنس کر کہا، "پہلے اسلام کو سلام کیجئے، پھر کرسٹان ہو جایئے، یہی مطلب ہے نا تمہارا محسن!"

"اسلام چھوڑنے کا سوال نہیں۔ سوال آزادی کا ہے، اور آزادی جس قیمت پر بھی ملے ضرور لینی چاہیئے۔" محسن نے کہا۔

چائے ختم ہو چکی تھی۔ لوگ ادھر ادھر گھومنے لگے، اقبال کرسی سے اٹھا اور بولا۔

"چلو چھوڑو اس بحث کو آؤ ذرا ہم بھی سیر کریں۔"

ان واقعات کو بہت روز گذر چکے تھے، ثریا خورشید کی نامرادیوں کے راز سے واقف ہو چکی تھی۔ محسن کا اقبال کے یہاں آنا جانا کچھ زیادہ ہو گیا تھا۔ خورشید کو اس کی باتوں میں لطف بھی بہت آتا۔ لیکن احسن کو محسن کا خورشید سے یوں بے حجابانہ ملنا کچھ پسند نہ تھا۔ اور وہ کبھی کبھی ثریا سے اس کا ذکر بھی کرتا۔ احسن کو بھی شکار کا بہت شوق تھا، اقبال اور احسن دونوں مل کر شکار جایا کرتے تھے، لیکن جب سے خورشید اقبال کے ساتھ جانے لگی تھی، احسن کا ساتھ چھوٹ گیا تھا۔

ادھر محسن سے ملاقات ہونے سے خورشید میں ایک تغیر سا پیدا ہو چلا تھا۔

محسن کے آتے ہی خورشید اور محسن کے درمیان آزادی اور مغربی تعلیم و تمدن پر بحث شروع ہو جاتی، اقبال خاموش بیٹھا دونوں کی باتیں سنتا اور کبھی یہ کہہ کر کہ "پاگلوں میں انسان پاگل ہی ہو جاتا ہے" پاس سے اٹھ جاتا۔

ایک روز احسن، محسن اور ثریا خورشید کے یہاں کھانے پر مدعو تھے، محبت پر بحث شروع ہو گئی، احسن کا نظریہ یہ تھا کہ میاں بیوی ایک دوسرے سے محبت کئے بغیر بھی پُرلطف زندگی بسر کر سکتے ہیں۔ لیکن محسن کو اس سے اتفاق نہیں تھا۔ اس کی رائے میں ازدواجی زندگی کا لطف اس وقت تک حاصل نہیں ہو سکتا جب تک طرفین میں محبت نہ ہو، وہ چاہتا تھا کہ ہندوستان میں بھی لڑکیوں کو اتنی آزادی ضرور ملنی چاہیئے کہ وہ اپنی پسند کا شوہر انتخاب کریں۔ لیکن ثریا اس کے خلاف تھی۔ اس کا خیال تھا کہ مرد ایسا دل پھینک واقع ہوا ہے کہ جہاں اچھی صورت نظر آئی وہیں مچل گیا۔ وہ یہ بھی طنزاً کہہ گئی کہ "بعض مرد محض نفس پرستی کی خاطر ایک معصوم عورت کی زندگی تباہ کر ڈالتے ہیں"۔

اس پر محسن نے پوچھا

"یہ کیسے ہو سکتا ہے"

"جیسے دنیا میں ہو رہا ہے" ثریا نے جواب دیا۔

محسن نے کہا۔

"کوئی مثال پیش کیجیے، کوئی دلیل دیجیے۔"

اس وقت خورشید کے چہرے پر ایک رنگ آتا تھا، ایک جاتا تھا۔ اسے خوف تھا کہ ثریا کہیں اس کے راز کی بات کہہ نہ ڈالے۔ لیکن ثریا بھی کوئی کچی گولیاں نہیں کھیلی تھی ہنس کر بولی۔

"دلیل دینے اور مثال پیش کرنے کا ابھی وقت نہیں، آپ یہ تو فرمایئے آپ شادی کیوں نہیں کرتے؟"

"مجھے ابھی تک میری پسند کی عورت نہیں ملی، محسن نے جواب دیا۔

پاس سے احسن ہنس کر بولا۔

"مرے یار! محض اناڑی ہو تم بھی۔ یورپ سے لے آئے ہوتے۔"

"حضرت!" محسن بولا، "اناڑی تو وہ ہیں جو یورپ سے بیوی لے آتے ہیں، مرد جس رنگ میں چاہے عورت کو رنگ سکتا ہے۔"

اقبال جو اس وقت تک خاموش بیٹھا تھا۔ بولا

"یہ آپ نے بالکل ٹھیک کہا۔ واقعی مرد جس رنگ میں چاہے عورت کو رنگ سکتا ہے۔"

پاس سے ثریا بولی

"خواہ رنگ چڑھانے کے لئے کچھ سختی ہی کرنی پڑے۔"

"سختی کیوں؟" اقبال نے کہا۔

"چلئے!" ثریا بولی۔ "سختی نہ سہی دولت کے بل بوتے سہی لیکن یاد رکھئے

عورت کی مسرت دولت سے کبھی خریدی نہیں جاسکتی۔"

"واہ!" احسن ہنس کر بولا "قربان جاؤں کیا بھونڈی دلیل ہے، عورت اگر دولت پا کر خوش نہیں ہوسکتی تو پھر اور کوئی چیز بھی اسے خوش نہیں کرسکتی۔"

"محض غلط ہے۔" ثریا شوہر کی طرف دیکھ کر بولی "ہاں یہ کہئے کہ جہاں تک ضروریات زندگی کا تعلق ہے، یا ہم جنسوں میں وقار اور عزت کا سوال ہے اس کے لئے دولت کا ہونا ضروری ہے، لیکن دولت سے اطمینانِ قلب تو کوئی خرید سکتا نہیں۔ اس سے دلی مسرت تو مول نہیں لی جاسکتی۔"

یہ سن کر خورشید کی پیشانی پر عرقِ انفعال کے قطرے موتیوں کی طرح چمکنے لگے، ساتھ ہی اقبال کے دل پر بھی ایک ایسا چرکا لگا کہ اس نے سر جھکالیا۔ احسن بولا "اب لگے ہاتھوں یہ بھی فرمادیجئے کہ یہ آپ کا اطمینانِ قلب اور دلی مسرت عورت کیسے پاسکتی ہے۔"

"اطمینانِ قلب، ایک مرد کی محبت سے" ثریا نے شوہر کی طرف دیکھتے جواب دیا، "اور دلی مسرت اولاد سے، منہ دیکھے کی محبت سے نہیں، اب سمجھ گئے آپ۔"

"اور جس کی قسمت ہی میں اولاد نہ ہو؟" احسن نے پوچھا

لیکن پیشتر اس کے کہ ثریا شوہر کو کچھ جواب دے، محسن بولا۔

"اسی لئے تو مغربی تمدن کو برکت سمجھتا ہوں، عورت جب چاہے شوہر سے طلاق

حاصل کر سکتی ہے۔"

"ابھی جناب" احسن نے کہا۔ "یہ آپ مغربی تمدن کیلئے پھرتے ہیں کبھی اسلامی شریعت کا مطالعہ بھی کیا آپ نے؟"

"بہت فضول بحث لے بیٹھے آپ!" کہتے ہوئے خورشید اٹھی اور ثریا کا ہاتھ پکڑ کر بولی

"آؤ ذرا باغ کی سیر کریں۔"

اس واقعہ کے دو ایک روز بعد اقبال اپنے دوست احسن کے یہاں گیا، احسن موجود نہیں تھا، ثریا جسے اقبال اپنی منہ بولی بہن کہتا تھا موجود تھی دونوں میں ادھر ادھر کی باتیں ہونے لگیں، پھر خورشید کا ذکر شروع ہوگیا؛ اقبال کہنے لگا

"جانے کیا بات ہے خورشید کچھ کھوئی کھوئی سی رہتی ہے۔"

"یہ آپ جانیں۔" ثریا نے کہا، "لیکن ہے کچھ ضرور۔"

"ثریا" اقبال بولا۔ "تم میری بہن ہو، ایک بات پوچھوں۔"

"پوچھئے۔"

"محسن کے متعلق تمہارا کیا خیال ہے؟"

"بہت شریف آدمی ہے۔" ثریا نے جواب دیا، "صرف مغربی تعلیم کا رنگ زیادہ چڑھ گیا ہے۔"

"میرا یہ مطلب نہیں" اقبال نے کہا "میں دیکھتا ہوں کہ خورشید اس کی سوسائٹی کو کچھ زیادہ پسند کرتی ہے"

یہ سن کر ثریا نے ذرا تیوری چڑھا کر کہا

"اگر ان باتوں کا خیال تھا تو پھر خورشید کا غیر محرموں سے تعارف کیوں کروایا"

اب اقبال نے ذرا ناراضگی کے طور پر کہا

"ثریا! تم شاید بھول گئیں کہ میں شوہر بھی ہوں"

"اور خورشید عورت ہے" ثریا نے جواب دیا "شاید آپ کو یہ بھی معلوم ہو گا، کہ عورت ہمیشہ ایک مرد کی سوسائٹی کو پسند کرتی ہے"

اقبال کا سر خود بخود جھک گیا۔ ثریا کہنے لگی۔

"مجھ سے خورشید کی کوئی بات نہیں چھپی، اطمینان رکھئے، سوائے اس کے کہ وہ محسن کی باتوں میں دلچسپی لیتی ہے اور کچھ بھی نہیں"

اقبال نے سر اٹھا کر ثریا کی طرف دیکھا اور کہا

"لیکن ثریا جب کوئی کسی کی باتوں میں دلچسپی لیتا ہے تو ظاہر ہے کہ اسے اس شخص سے بھی کچھ نہ کچھ دلچسپی تو ضرور ہو گی"

"ٹھیک ہے" ثریا بولی، "لیکن اگر آپ کو ان باتوں کا شکوہ کرنا تھا تو آپ نے یہ راہ ہی کیوں اختیار کی، خورشید غریب نے تو کبھی اس قسم

کی خواہش نہ کی ہوگی۔"

"خواہش" اقبال بولا، "وہ تو ہمیشہ انکار ہی کرتی رہی محض میرے مجبور کرنے سے پردہ ترک کیا۔"

"اور آپ نے مجبور کیوں کیا؟" ثریا نے پوچھا

"محض خورشید کو خوش کرنے اور خوش دیکھنے کے لئے۔" اقبال نے جواب دیا۔

"اور اب جب آپ اسے خوش دیکھتے ہیں تو اس سے محروم کیوں کرنا چاہتے ہیں؟" ثریا نے پوچھا۔

"نہیں ثریا نہیں" اقبال نے ایک آہ بھر کر کہا، "میں تو خورشید کو خوش دیکھنے کے لئے جان تک قربان کر دوں۔"

"آپ کو جان قربان کرنے کی ضرورت نہیں۔" ثریا کہنے لگی، "لیکن جس وہم میں آپ پڑے ہیں کہیں یہ خورشید کو ہلاک نہ کر ڈالے۔"

"وہم" اقبال نے پوچھا، "کیسا وہم؟"

"اب بتلا ہی دوں" ثریا نے ہنس کر کہا

"ثریا" اقبال بولا، "تمہیں میرے سر کی قسم ہے سچ سچ کہہ دو۔"

"آپ کو شک ہے کہ خورشید کو محسن سے محبت ہے" ثریا نے پوچھا "ٹھیک ہے نا؟"

"محسن کو نہ سہی" اقبال بولا "لیکن خورشید تو اسے پسند کرتی ہے!"

"کسی کو پسند کرنا تو گناہ نہیں" ثریا نے جواب دیا "بھیا! خدا کی قسم! اگر چراغ لے کر بھی ڈھونڈو تو خورشید ایسی باوفا، پاکباز اور غمگسار عورت آپ کو نہ ملے گی، آپ کو ایسی عورت کی قدر کرنی چاہیئے جس نے اپنی جوانی، اپنا شباب، اپنی آرزوئیں اور تمنائیں محض آپ کے ایک شوق کی خاطر قربان کر رکھی ہیں۔"

اقبال نے یہ سن کر سر جھکا لیا، کچھ دیر بعد وہ جانے کے لئے اٹھا اور ثریا کی طرف دیکھ کر بولا۔

"ثریا تم نے سچ کہا ہے، بیشک جو عورت ایک بدنصیب مرد کے لئے اپنی جوانی برباد کرے، مرد کو بھی اس کے لئے کچھ ایثار کرنا ضرور چاہیئے۔"

آج ایک عورت سے کھری کھری سن کر اسے اپنی زندگی ایک بار محسوس ہونے لگی تھی، اور خورشید کو وہ بہت مظلوم سمجھنے لگا تھا۔ اب اس کے لئے صرف ایک ہی راہ کھلی تھی، اور یہی راہ اختیار کرنے سے وہ خورشید کو اس کی کھوئی ہوئی مسرت واپس دلا سکتا ہے اور وہ موت کی راہ تھی خورشید کو تفکرات اور رنج والم سے آزاد کرنے کی ایک ہی صورت تھی

اور وہ یہ تھی کہ وہ جان شیریں اب اس عورت کی تمناؤں، آرزوؤں اور حسرتوں پر قربان کر دے، جسے اس کی خود غرضی اور نفس پرستی نے زندہ درگور کر رکھا تھا۔

رات کا وقت تھا اور گرمیوں کی رُت اور دریا کا کنارہ، ماہ منیر بام فلک پر بسیہ بڑی آب و تاب سے انجم آرائی کر رہا تھا۔ اور چاندکی کرنیں سینہ آب پرستوں کی طرح رقص کر رہی تھیں، ایک موٹر دریا پر آکر رکی، محسن، احسن اور ثریا، اقبال اور خورشید اترے اور کشتی میں بیٹھ کر دریا کی سیر کرنے لگے، محسن اور احسن چپو چلانے لگے، اور اقبال کشتی کو قابو میں رکھنے کے لئے پتوار سنبھال کر بیٹھ گیا۔ ثریا اور خورشید درمیانی نشستوں پر ہو بیٹھیں، چپو جب مسلسل پانی میں پڑتے تو فضا میں ایک زیر و بم سا پیدا ہو جاتا۔

محسن بولا

"دریا کا لطف تو اہل یورپ ہی کچھ لیتے ہیں۔"

"مرے یار" احسن کہنے لگا، "یہ مغل اس معاملہ میں تمہارے یورپ والوں سے بھی بڑھے ہوئے تھے۔"

ثریا بولی:۔

بھیا محسن! یورپ میں کیا ہوتا ہے ؟"

"اس وقت یورپ میں دریاؤں میں بھی آپ کو ایک دنیا نظر آئے گی یعنی آپ پر ہر طرف کشتیاں ہی کشتیاں نظر آئیں گی، کوئی نہا رہا ہوگا، کوئی گا رہا ہوگا، کہیں کشتیوں کی دوڑ ہو رہی ہوگی۔"

خورشید بولی

"آؤ ثریا ذرا ہم بھی کشتیوں کی دوڑ کرائیں۔"

"لیکن دوسری کشتی کہاں ہے ؟" ثریا نے پوچھا

اقبال کے کوٹ کے بٹن ہول میں گلاب کا ایک سرخ پھول تھا، خورشید نے اُچک کر یہ پھول بٹن ہول میں سے نکال لیا اور بولی

"یہ پنکھڑیاں جو ہیں، یہی کشتیاں بنیں گی۔"

یہ کہتے ہوئے اس نے تھوڑی سی پنکھڑیاں ثریا کو دے دیں،

خورشید بولی

"لیکن منصف کون ہوگا ؟"

"بھیا جو آگے بیٹھے ہیں۔" ثریا بولی، "جس کی پنکھڑی آگے نکلے گی وہ کہہ دیں گے۔"

"تو آؤ پھر ڈالو" خورشید بولی

ثریا اور خورشید دونوں ایک ساتھ پنکھڑیاں دریا میں پھینکیں

جس کی آگے نکلتی اقبال اس کا نام لے دیتا۔
محسن کچھ گنگنانے لگا، احسن بولا
"مرے یار! آواز سے کہو تو ہم بھی کچھ سنیں"
محسن نے ذرا لوچ دار آواز میں یہ شعر پڑھا ؎

ہوئے مرکے ہم جو رسوا، ہوئے کیوں نہ غرقِ دریا
نہ کبھی جنازہ اٹھتا، نہ کہیں مزار ہوتا

اقبال نے ایک آہ بھر کر کہا
"واللہ! موت ہو تو ایسی ہی ہو۔ ہاں محسن! پھر کہنا ذرا!"
اور ثریا نے کہا
"بھیا ہماری تو کشتیاں بھی ختم ہولیں، آپ نے تو ایک بھی نہیں پکڑی"
خورشید اپنا رومال نکال کر بولی
"ثریا آؤ رومال پانی پر ڈالتے ہیں جو جیتے وہی رومال لے"
ثریا نے بھی اپنا رومال نکالا اور اقبال سے کہا
"بھیا! دیکھنا ہمارے رومال پکڑ لینا"
دونوں نے اپنے اپنے رومال ساتھ ساتھ پانی میں ڈال دیئے اور جھک جھک کر دیکھنے لگیں، خورشید کا رومال اقبال تک پہنچتے پہنچتے

آنکھوں سے اوجھل ہوگیا، وہ چلا کر بولی۔

"میرا رومال پکڑنا، کہیں ڈوب نہ جائے!"

"کہاں ہے؟" اقبال ادھر ادھر دیکھ کر بولا

ساتھ ہی رومال پھر سطح پر ابھرا اور خورشید ہاتھ سے اشارہ کرکے بولی۔

"وہ رہا، لینا!"

اقبال اٹھ کر کھڑا ہو گیا، اس کے کھڑے ہونے سے کشتی جو ڈگمگانے لگی تو ثریا نے کہا:-

"بھیا دیکھنا کہیں گر نہ جانا!"

"ثریا" اقبال بولا، "اگر خورشید کے رومال کی خاطر جان بھی چلی جائے تو کوئی بڑی بات نہیں"

یہ کہنے کے ساتھ ہی اس نے دریا میں چھلانگ لگا دی، پانی میں ایک گرداب پڑا، خورشید دہشت زدہ ہو کر دیکھنے لگی، اقبال ایک بار پھر ابھرا، محسن اور احسن نے اسے پکڑنے کے لئے زور زور سے چپو چلائے، لیکن وہ چشم زدن میں آنکھوں سے اوجھل ہو گیا۔ خورشید ایک چیخ مار کر ثریا کی گود میں گر پڑی اور بیہوش ہو گئی۔

احسن اور محسن نے دور دور تک دریا چھان مارا، لیکن اقبال کا

پتا نہ ملا، آخر مایوس ہوکر یہ لوگ کنارے کی طرف لوٹے، چپو جب پانی میں پڑتے تو ان کی آواز کسی کی سینہ کوبی سے ملتی جلتی معلوم ہوتی۔ اس وقت کنارے پر بیٹھا کوئی

ساجن پردیس گئے میں بیٹھی ندی کنارے
گھر جاؤں سیاں کیسے جب ساجن پاس نہ آوے

بڑی سوز بھری آواز میں گا رہا تھا۔